آگ مصروف ہے
تمام کتابیں بشیر رانی فاروقی کے پی ڈی ایف
میں تبدیل کی جاتی ہیں۔
مصنف کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔
سید حسین احسن۔ فیس بک گروپ
کتابیں پڑھئے
03145951212
03448183736
مظفر حنفی

آگ مصروف ہے

مظفر حنفی

مظفر حنفی

آگ مصروف ہے

مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

AAG MASROOF HAI : BY. MUZAFFAR HANFI

سنہ اشاعت ۲۰۰۴ء

پہلا ایڈیشن پانچ سو

قیمت ۱۰۰/۰ روپے

کتابت نقار الرحمٰن

سلسلۂ مطبوعات مدھیہ پردیش اردو اکادمی : ۸۹

سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے ایچ۔ ایس۔ آفسٹ پرنٹرز، چوک سوئی والان، دلی میں چھپوا کر، دفتر اردو اکادمی، ملا رموزی سنسکرتی بھون، بان گنگا روڈ، بھوپال ۴۶۲۰۰۳ سے شائع کی

بھوپال کی کھٹی میٹھی یادوں

کے نام

•

پردیس نہ جانا کبھی بنگال کو ہم نے
کلکتہ میں دلّی کبھی بھوپال بچھایا

•

سولہ دلی میں کٹے سترہ برس بھوپال میں
بارہ برساتیں گزاریں مغربی بنگال میں

•

مظفر حنفی

۲۳ر اکتوبر ۲۰۰۳ء

حرفِ آغاز

ایک منفردِ صاحبِ قلم، ایک نئے مزاج اور آہنگ کے شاعر، ایک انوکھے انداز کے نثر نگار، جس نے زبان اور اسلوب کو ایک نئی طرز دے کر نئی سمت عطا کی اور زبان و ادب کی سنگلاخ سرزمین پر نئی فکر کے چراغ جلائے ...... اور ان سب سے بڑھ کر ایک حساس اور جذباتی انسان اور اس سے بھی زیادہ ایک مخلص دوست جو ہمیشہ غم جاناں کا نہیں بلکہ غم دوراں کا شکار اپنی ہی مرضی سے بنا رہا اور جس نے اپنی خودداری اور وقار کا نہ کبھی سودا کیا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی سمجھوتہ .... کسی طبیب کے نسخے میں اگر ان اجزا کا مرکب بنایا جائے تو اسے مظفر حنفی کہتے ہیں۔

مظفر صاحب میرے بہت پرانے دوست ہیں اور ہمیشہ سے ہی ان کی کرم فرمائی اور نوازشات کی بارش کی سحرانگیز بوچھار مجھے شرابور کرتی رہی ہے اور المیہ یہ کہ میں اسے کبھی ریٹرن نہیں کر پایا۔ یوں تو میری ملاقات ڈاکٹر مظفر حنفی سے اس زمانے سے ہے جب وہ سیلفیہ کالج کے طالب علم اور اس کے بعد سیہور (مدھیہ پردیش) میں محکمۂ جنگلات کے ایک سرکاری افسر تھے .... سیہور میری سیاسی زمین ہے اور میدانِ عمل بھی اور پہلی بار میں اسی حلقہ انتخاب سے ۱۹۷۲ء میں ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہوا تھا اور بعد میں مدھیہ پردیش سرکار کا وزیر بنا..... لیکن مظفر صاحب سے زیادہ قرب کے لیے میں ڈاکٹر صغریٰ مہدی کا ممنونِ کرم ہوں اور یہ انھیں کا احسان ہے کہ ان کی وجہ سے مجھے اصلی مظفر حنفی کو سمجھنے اور پہچاننے کا موقع ملا ...... یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب

۱۹۸۴ء میں میں ستنا (مدھیہ پردیش) سے لوک سبھا کا چناؤ جیت کر ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوا اور ۳۱-کیننگ لین میں مجھے رہائش کے لیے الاٹ کر دیا گیا اور میرا زیادہ وقت دہلی میں گزرنے لگا۔ حالانکہ میرے سگے چھوٹے بھائی مصباح الحسن انڈین ایر لائنز میں اپنی سروس کی وجہ سے کئی سال پہلے سے دہلی میں رہائش پذیر ہیں اور اس کے علاوہ بھی کئی قریبی عزیز و اقارب تھے لیکن میری سرپرست بیگم صالحہ عابد حسین (اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے درجات بلند فرمائے) تھیں۔ جن کو نہ صرف میرے کھانے پینے اور رہن سہن کی فکر رہا کرتی تھی بلکہ میری صحت کے لیے بھی وہ ہمیشہ پریشان رہا کرتی تھیں اور زبردستی ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے اپنے مخصوص ڈاکٹر ماتھر کے پاس جو ہولی فیملی اسپتال کے بلکہ یوں کہیے کہ دہلی کے ایک ممتاز ڈاکٹر تھے، مجھے ان کو دکھانے اور علاج کے لیے لے جایا کرتی تھیں۔ کیونکہ میں اس زمانے میں دہلی میں اکیلا ہی رہا کرتا تھا۔ اس لیے مرحومہ بیگم صالحہ عابد حسین نے اور ان کے ساتھ ان کے خاندان کے افراد نے جن میں سب سے نمایاں ڈاکٹر صغریٰ مہدی ان کے بھائی اور بھابھی ڈاکٹر صفیہ مہدی اور رضا مہدی اور صالحہ آپا کی دو بھتیجیاں ڈاکٹر ذکیہ ظہیر اور ڈاکٹر سیدہ حمید..... ان سب نے مل کر جس طرح میرا خیال رکھا اور اپنے ہی خاندان کے ایک قریبی عزیز کی طرح جتنی میری پذیرائی کی اس احسان مندی کے احساسات کے نقوش تا زندگی دل پر نقش رہیں گے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی بھی بیگم صالحہ عابد حسین کے معتقدین میں سے ایک تھے اور ہم دونوں میں ایک مشترکہ قیمتی اثاثہ جو تھا وہ ڈاکٹر صغریٰ مہدی کی دوستی تھی اور اکثر عابد ولا میں اور وہاں کی ادبی محفلوں میں ان سے ملاقات رہا کرتی تھی۔

انھیں دنوں کی بات ہے جب ایک دن میں عابد ولا پہونچا تو مجھے بہت ہی پُرخلوص انداز میں ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے ایک کتاب دکھائی جو ڈاکٹر مظفر حنفی کی تھی اور انھوں نے خصوصی طور پر ڈاکٹر صغریٰ مہدی کو اپنے قلم سے کچھ عبارت لکھ کر بھیجی تھی جس کی شروعات اقبالؔ کے اس مصرعہ سے تھی ؎

ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو.....؟

ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے مجھے بڑے فاتحانہ انداز سے اسے دکھاتے ہوئے کہا کہ دیکھیے مظفر صاحب نے ہماری کتنی قدر و قیمت کی اور ہمارے لیے اقبال کا مصرعہ لکھا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ "محترمہ یہ تو ٹھیک ہے مگر گستاخی معاف یہ مصرعہ تو جبرئیل نے ابلیس کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے۔ غالباً مظفر صاحب خود اپنا اور آپ کا یہ ہی تعلق سمجھتے ہیں"۔ یہ سن کر صغریٰ مہدی ایک دم خاموش ہوگئیں۔ اس کے بعد مظفر صاحب پر کیا گزری ہوگی یا نہیں...... ؟ یہ تو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو "عتابِ صغروی" اور "جمالِ صغروی" دونوں سے واقف ہوں..... لیکن میرا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کچھ دن بعد مجھے ایک بند پیکٹ ملا جس میں مظفر صاحب کی کتاب تھی اور ان کے اپنے ہی مخصوص قلم سے کچھ لکھ کر انھوں نے مجھے بھیجی تھی اور عبارت کچھ اس طرح کی تھی: "محترم آپ نے جو شوشہ چھوڑا ہے اس کی سراہنا کرتے ہوئے اپنی کتاب آپ کی نذر کر رہا ہوں"۔

لیکن ایک حساس شاعر اور ادیب ہونے کے بعد بھی غالباً جہاں تک صنفِ نازک کا تعلق ہے مظفر صاحب میں کچھ شئے لطیف کی کمی ہے..... یہ بھی انھیں دلوں کی بات ہے جب وہ جامعہ ملیہ میں اردو کے پروفیسر اور صغریٰ مہدی بھی اسی شعبہ میں برسرِ کار تھیں۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی کی ایک بہت ہی قریب ترین دوست اور رفیق جو خود بھی ایک دوسرے شعبہ میں لیکچرر تھیں اور اپنے ناز و انداز کے تیر برسانے میں ملکہ رکھتی تھیں ان کا محبوب مشغلہ اپنے عشوہ و غمزہ اور ناز و انداز کے تیر دوسروں پر چلا کر اپنے آس پاس مداحوں کی ایک لمبی قطار لگانا تھی اور بعد میں ان کو بسمل چھوڑ کر اپنی توجہ کسی دوسرے پر مرکوز کرنا تھی۔ لیکن مظفر صاحب نہ جانے کس بلٹ پروف دھات میں ڈھلے ہوئے ہیں کہ ان محترمہ کے کسی بھی ناز و انداز کے تیروں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا حالانکہ اُن محترمہ کا ترکش خالی ہوگیا اور ایک دن مظفر صاحب نے بہت ہی پریشان کن انداز میں ڈاکٹر صغریٰ مہدی کو اپنی مدد اور بچاؤ کے لیے آواز دی اور ان سے درخواست کی کہ "خدارا اپنی ان دوست کو سمجھائیں کہ وہ یونیورسٹی میں اور پبلک مقامات پر مجھ سے ذرا فاصلہ رکھا کریں"...... مجھے جب یہ معلوم ہوا تو میں ڈاکٹر مظفر حنفی کی اس بد ذوقی پر

کفِ افسوس ملتا رہ گیا......!

یہ سب باتیں تو میں نے خیز زیب داستاں کے لیے لکھ دی ہیں لیکن ڈاکٹر مظفر حنفی ان شخصیات میں سے ہیں جن سے ادب اور ادیب کی خودداری اور انسان دوستی کی روایات صرف قائم ہی نہیں بلکہ دوبالا ہو جاتی ہیں اور اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ایسے ہی تاریخ ساز شخصیت کا ذکر جب مؤرخ کرتا ہے تو خود اس کی اپنی جبیں جگمگانے لگتی ہے اور اس کی خاص وجہ ان کی اپنی انا، خودداری اور قلندرانہ اندازِ فکر اور طرزِ زندگی ہے جو یقیناً دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

میں ان کا مشکور اور ممنونِ کرم ہوں کہ انھوں نے میری بار بار درخواست پر اپنی اس کتاب کو شائع کرنے کی مدھیہ پردیش اردو اکادمی کو اجازت دی اور آخر میں یہ سب لکھتے وقت مجھے ان ہی کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

انا تھی مظفر کی خنجر بکف
وہاں اور کوئی نہ تھا 'یا اخی'

اور اس کے ساتھ ہی علی جواد زیدی کے ان کے بارے میں لکھے ہوئے یہ الفاظ بھی یاد آرہے ہیں" مظفر کے یہاں انا خنجر بکف ہے اور اسے زخمی بھی کرتی ہے یہاں تک کہ سسکتے اور تلملاتے رہنا قسمت بن جاتی ہے .... یہ انا سناں سے تیز لیکن دل و جگر میں کبھی اس طرح پیوست نہیں ہوتی کہ ذات کا خاتمہ ہو جائے ذات کا طلسم بکھر جاتا ہے، انا کا جادو مر جاتا ہے لیکن" خود آگہی " آئینہ دکھاتی رہتی ہے۔"

عزیز قریشی

چیرمین

مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

اختر سعید خاں

مظفر حنفی سخن کے آئینے میں

بھول چکے تھے ہمسفر پیش روؤں کا احترام
توڑ دی میں نے چوم کر بندشِ نقشِ پا کہ یوں

مظفر حنفی کا یہ شعر تہذیب انحراف کا خوبصورت نمونہ ہی نہیں، ان کے شعری رویّے کا نشان بھی ہے۔ بندشِ نقشِ پا کو چوم کر توڑ دینا ان کی روش بھی ہے اور کارنامہ بھی۔ ان کی غزل اس بات کا اعلان ہے کہ خضر منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں۔ یہ وہی غالب ہے جس کی رفتار نہ کسی بندش پا کی پابند تھی نہ جس کی صاحب نظری دین بزرگاں کو خوش کر سکی۔ مومن ہی نہیں عام شعراء کا خیال ہے کہ دعا کو اثر کے ساتھ دشمنی ہے لیکن مظفر حنفی نے خدا جانے کس گھڑی میں دعا کی تھی جو فوراً قبول ہو گئی۔

ویسے تو مظفر کی تمنائیں بہت ہیں
آہنگ الٰہی، مرا آہنگ الٰہی

چنانچہ پچھلے ۴۰ برسوں سے ایوان شاعری میں مظفر حنفی کا اپنا آہنگ غزل گونج رہا ہے۔ یہ آہنگ اس وقت بھی منفرد تھا جب نئے لب و لہجہ کے ذوق و شوق میں پوری ایک نسل ایک ہی لے میں ایک ہی نوع کے الفاظ و معانی کا ورد کر رہی تھی اور ایک آواز کو دوسری آواز سے ممیز کرنا محال تھا اور آج بھی منفرد ہے جب سینکڑوں آوازوں میں سے چند ایک اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ مظفر کی ابتدائی شاعری کا مطالعہ کیجیے یا آج کی شاعری کا، قاری کو محسوس ہوگا کہ جو شخص اس سے خطاب کر رہا ہے

وہ مکمل اکائی ہے۔ لہجہ، لفظیات، اظہار کے وسیلے، خیالات کی رو، ندرت بیان، جدت طرازی، نئی زمینیں، نئے گوشے۔ غرض جو کچھ ہے اور جیسا ہے اس کا اپنا ہے۔ اگر کسی دوسرے کا خیال اسے اظہار کے لیے اکساتا بھی ہے تو وہ اس پر اختلافی نوٹ لگا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

میرے نزدیک انکار، اقرار سے زیادہ جرأت کا کام ہے۔ باغیانہ اور منحرفانہ رقیے کی اپنی اہمیت ہے۔ فرد، سماج اور نظام حکومت سے تعمیری انحراف و احتجاج تاریخ ساز تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ آج جس دور میں ہم جی رہے ہیں، اس عہد کی پوری زندگی میں یہی احتجاجی لہر کار فرما ہے اور مظفر کی شاعری کا بڑا حصّہ اسی احساس کی صدائے بازگشت ہے۔

مظفر نے زندگی کی ناہمواریوں کو اندر سے جھانک کر دیکھا ہے اور اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ کبھی طنز کا وار کیا ہے کبھی فکر و تدبر سے جائزہ لیا ہے اور کبھی دردمندانہ آہ کی ہے۔ ان کی غزلوں کا بڑا حصّہ طنز سے عبارت ہے اور دنیائے ادب میں وہ اپنے تیوروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ غزل میں طنز کی روایت نئی نہیں ہے لیکن ابتدا میں اس کا دائرہ حکایت بایار گفتن تک محدود تھا۔ غزل میں جب سیاسی اور سماجی موضوعات نے اپنا اعتبار قائم کر لیا تو طنز کا نشانہ بھی بدل گیا۔ مظفر کی غزل اسی سلسلہ کی ارتقائی کڑی ہے۔ میرے نزدیک طنز نگاری بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب اسے تلوار پر چلنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ اک ذرا سی غفلت سے طنز کا تیر الٹ کر چلانے والے کے سینہ پر آلگتا ہے۔ طنز دراصل نامساعد حالات اور زندگی کی ناہمواریوں سے برہمی اور بیزاری کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم جس چیز سے برہم یا بیزار ہوتے ہیں اسے بدلنے کی خواہش عین تقاضائے فطرت ہے۔ مظفر کی طنزیہ غزلیں بھی ہر ناپسندیدہ شے کو بدل ڈالنے کی متقاضی ہیں۔ یہ جداگانہ بحث ہے کہ مظفر جن چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں وہ بنیادی طور پر بدل ڈالنے کے قابل ہیں بھی یا نہیں بہر صورت طنز نگار کا رویہ تخریبی نہیں ہوتا وہ طنز سے خنجر کا نہیں نشتر کا کام لیتا ہے۔

طنزیہ غزل میں مظفر کے پیش رؤوں میں یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی کے نام اردو شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یگانہ چنگیزی ابتدا میں جس معنی خیز طنز اور تیکھے تیوروں کی وجہ سے ممتاز ہوئے تھے وہ آگے چل کر ان کے فن کا زوال ثابت ہوا۔ شاد عارفی نامساعد حالات اور اپنی شدید تلخ نوائی کا شکار ہو گئے۔ ان دونوں بزرگوں کا آغاز اور انجام مظفر حنفی کے سامنے تھا۔ انھوں نے ذاتی تلخیوں اور رنجشوں کو نظر انداز کر کے زندگی کی ناہمواریوں کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ ان کے اشعار میں زندگی ایک کڑوا گھونٹ ہے اور ان کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے اس کڑوے گھونٹ کو خود تو پیا ہی ہے، اپنے قاری کے حلق کے نیچے بھی اتار دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ دونوں بے مزہ نہیں ہوتے۔ مظفر کی طنزیہ غزل کی جولانگاہ بہت وسیع ہے، محنت کا استحصال، عصبیت، فتنہ و فساد، احساس عدم تحفظ، بے تعلقی، ریاکاری، خود غرضی، فطرت سے دوری، ذہنی مسرت کا فقدان، رشتوں کی شکست، صنعتی زندگی کی پیدا کردہ الجھنیں، غرض عہد حاضر کے بیشتر مسائل جنھیں آج کی اصطلاح میں عصری حسیت کا نام دیا جاتا ہے ان کا موضوع شعر ہیں۔ وہ مشکل اور آسان زمینوں اور مانوس و ناموس بحروں میں والہانہ انداز سے شعر کہتے چلے جاتے ہیں اور ہر ردیف اور ہر قافیے میں شعر پرے باندھے ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ ان کے جستہ جستہ اشعار پڑھنے کے بجائے ان کی مکمل غزلیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر غزل ایک ہی نشست میں مکمل ہو گئی ہے۔ ان کی غزلوں کا معنوی تسلسل اور بے ساختگی اس کے شاہد ہیں کہ ان کا جذبہ، قوت تخیل اور قلم تینوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ ان کی غزل محض قادرالکلامی نہیں ہے، فطری جوش ہے جو روکے نہیں رکتا ہے چالیس برسوں میں ان کے گیارہ شعری مجموعوں کی اشاعت خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ میں نے اس نوع کے چند شعر نمونے کے طور پر منتخب کیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ اپنی ذاتی پسند کو مظفر کے انداز بیان پر مسلط نہ کروں، مگر میں دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنی ذاتی پسند کو صرف نظر کر سکا ہوں یا نہیں۔

ہر ایک شہر میں معصوم لوگ رہتے ہیں
خود اپنی ذات پہ ہیں سنگ باریاں میری

انھیں سچائی کے اظہار پر مجبور مت کرنا
سماعت کی حدوں سے دوستوں کو دور مت کرنا

آستیں کا راز آئینہ پہ روشن کر نہ دے
آپ کا چہرہ نصیب دشمناں اترا ہوا

یہ کام اہلِ سیاست نے لاجواب کیا
خفا کسی سے ہیں جینا مرا عذاب کیا

سابقہ عنایت سے آشیاں نہیں باقی
پھر بہار آئی ہے اور کیا ارادہ ہے

مقرر ہوئے رفع شر کرنے والے
چراغاں فسادات پر کرنے والے

پسماندگی پہ گاؤں کی ماتم بہت ہے یاں
اے مہربان شہر، ہوا کم بہت ہے یاں

اونچا ہوا سر نیزہ بہ نیزہ
یاروں کا احسان لبیک لبیک

ترستی رہیں روشنی کو نگاہیں
چمکتے رہے چاند تارے وغیرہ

میرا تمہارا ساتھ ہے اس مصلحت کے موڑ تک
تم کو کنارہ چاہیے مجھ کو سمندر چاہیے

فکری مسائل کے اظہار میں مظفر حنفی نے کسی مکتب خیال سے اپنی ذہنی وابستگی قائم نہیں کی ہے۔ وہ فرد، سماج اور اس کائنات کو کسی مخصوص زاویہ نظر یا طے شدہ منصوبے کے مطابق نہیں دیکھتے۔ انھوں نے نہ رجائیت کو کلیے کے طور پر اپنایا ہے نہ قنوطیت کو۔ وہ زندگی کے طرفدار ہیں لیکن موت کی بالادستی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ عزم و حوصلہ کے پاسدار ہیں لیکن اپنی بے دست و پائی کو بھی جانتے ہیں۔ ان کے شعر میں زندگی سے نبرد آزما ہونے کا جو حوصلہ ہے اور ہر راستہ روکنے والی طاقت سے ٹکرانے کا جو ولولہ ہے وہ ان کے تخلیقی سفر کو مثبت اقدار کی منزل تک لے جاتا ہے۔ مظفر کس راہ سے اس منزل تک پہنچیں گے اس کا جواب خود ان کا جذب شوق دے گا ہم آپ نہیں۔

پھول زخموں کے چنے، دھول کلہ پر رکھی
خون کی بوند مظفر نے مژہ پر رکھی

غم نہیں ہے، نوکِ خنجر ہو کہ پیکان سناں
مجھ سے ہم رشتہ بایں حال زبوں کوئی تو ہے

فنا میں زندگی کا استعارہ ڈوب جائے گا
یہ وہ دلدل ہے، جس نے سر ابھارا ڈوب جائے گا

سنا ہے زور گھٹ جائے گا دریا کا سویرے تک
مدد آنے سے پہلے گھر ہمارا ڈوب جائے گا

آسمانوں کو کہیں زیر و زبر ہم نہ کریں
ہر طرف روک لگی ہے کہ سفر ہم نہ کریں

کرمکِ شب ہیں تو پابند نہیں رہ سکتے
غیر ممکن ہے چراغوں پہ سفر ہم نہ کریں

چمن بندیوں کے سنہرے اصول
کوئی بھی پرندہ نہیں مانتا

سیاہ رات اور جھلملاتے ہوئے ستارے
ہم ایک تختے پہ نیم جاں، ہر طرف سمندر

تنکوں کے ارمان، لبیک لبیک
طوفان طوفان، لبیک لبیک

بیان درد کے لیے مظفر نے غزل کا وہی سنبھلا ہوا مانوس اسلوب اپنایا ہے جس نے غزل کو تمام اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مقبول صنف بنا دیا ہے لیکن کلاسیکی تصورات اور مسلمات میں بھی مظفر کا ذاتی تجربہ اور مخصوص زاویہ نگاہ ان کی انفرادیت کی غمازی کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس نوع کے اشعار میں تغزل کا رچاؤ، کسک اور تہذیب عشق کی پاسداری اس کی گواہ ہے کہ مظفر جدیدیت کے نام پر اپنے کلاسیکی ورثے سے دست بردار نہیں ہوئے ہیں۔ یہ اشعار مظفر کی غزلوں میں جہاں تہاں بکھرے ہوئے ہیں لیکن جب ان پر نظر

پڑجاتی ہے تو وہیں ٹھہر کر رہ جاتی ہے:

خوب اڑا لیا غبار، گھوم چکے ہر اک دیار
فائدہ دل کو کچھ نہیں، درد ضرور بڑھ گیا

ہاتھ خطا کا تھام لے، عفو و عطا سے کام لے
بندش و احتساب سے جرم و قصور بڑھ گیا

آپ نے آواز دی لیکن ذرا تاخیر سے
یعنی بڑھ کر لوٹنا ممکن نہ تھا میرے لیے

دنیا کو آپ میری نظر سے نہ دیکھیے
میں عرض کر چکا ہوں کہ دیکھی نہ جائے گی

تری تلاش میں کیا کیا نہ مرحلے آئے
ہر ایک راہ کہیں اور جا نکلتی تھی

کسی کو میں اپنا نہیں مانتا
مگر خود کو تنہا نہیں مانتا

عمر بھر لمس محبت کے لیے ترسا ہوں
اب جو شبنم نے چھوا ہے تو بکھر جانے دے

اک بار یوں خموش ہوئے وہ جواب میں
میرے سبھی سوال عرق ریز ہو گئے

لہو سے ہم نے کیے ان گنت دیئے روشن
بجھا کے ایک دیا تجھ کو آفتاب کیا

دیکھنا غزل کی اس وادی شاداب میں کوئی جوگی اکتارے پر گاتا جا رہا ہے۔ لہجے سے تو مظفر کی غزل معلوم ہوتی ہے :-

میں قصبے کا بھولا پنچھی اندر باہر ایک
جس شہری نے ہاتھ ملایا کاٹ لیا پر ایک

ٹوٹی پھوٹی ناؤ ہماری، زخمی دونوں ہاتھ
لیکن بے پتوار کیے ہیں سات سمندر ایک

گلشن پر دونوں کا حق ہے کانٹے ہوں یا پھول
ٹکرانے کی شرط نہ ہو تو شیشہ پتھر ایک

سونے کی ہر لنکا اُن کی اور مجھے بن باس
چتر سیانے دس دس سر کے مجھ مورکھ سر ایک

تمام کتابیں بغیر مالی فائدے
کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں۔
مصنف سے ہمارا متفق ہونا
ضروری نہیں۔
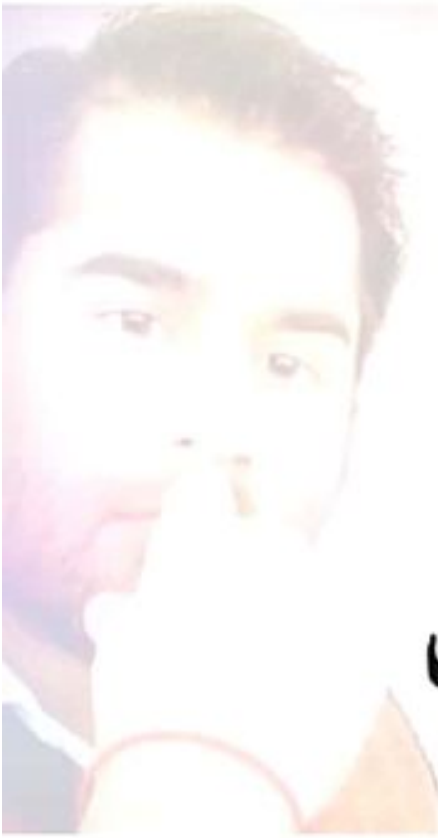
غزلیات

○

ہمارے گھر پہ کبھی سائبان پڑتا نہیں
یہ وہ زمیں ہے جہاں آسمان پڑتا نہیں

پڑاؤ کرتے چلے راہ میں تو چلنا کیا
سفر ہی کیا ہے اگر ہفت خوان پڑتا نہیں

بجھانی ہوگی ہمیں خود ہی اپنے گھر کی آگ
کہیں سے آئے گی امداد جان پڑتا نہیں

مزے میں ہو جو تمہیں بے زمین رکھا ہے
کہ فصل اُگاتے نہیں ہو، لگان پڑتا نہیں

عطا خلوص نے کی ہے یقین کی دولت
گمان اُس کے مرے درمیان پڑتا نہیں

ہم احتجاج کسی رنگ میں نہیں کرتے
ہمارے خون سے کوئی نشان پڑتا نہیں

بہتروں میں اسے بھی تلاش کر لینا
مباحثے میں مرا خاندان پڑتا نہیں

○
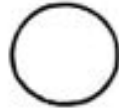
دریا اُتھلے پانی میں کیا کرتے ہیں
تنکے اِس طغیانی میں کیا کرتے ہیں

پتھر ہیں تو شیش محل پر جائیں نا!
گھاؤ مری پیشانی میں کیا کرتے ہیں

تنگی میں وہ سجدے کرتے رہتے تھے
دیکھیں تن آسانی میں کیا کرتے ہیں

رہنے دیں ویرانے کو ویرانہ ہی
دیوانے نادانی میں کیا کرتے ہیں

سب اچھے لگتے ہیں اپنی کرسی پر
چاند ستارے پانی میں کیا کرتے ہیں

کِھلتے ہیں وہ، حیرانی میں دنیا ہے
پھول یہاں ویرانی میں کیا کرتے ہیں

○
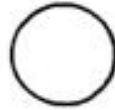
کر گئے ہجرت پرندے پھر چلی ٹھنڈی ہوا
ہے شگوفوں کا دمِ آخر چلی ٹھنڈی ہوا

آستیں شبنم نے تر کی سبزۂ بیگانہ کی
غنچۂ نورستہ کی خاطر چلی ٹھنڈی ہوا

زرد رومال اپنا جھٹکا تھا خزاں نے اُس طرف
گلستاں سے کہہ کے جی حاضر، چلی ٹھنڈی ہوا

دیکھ لینا بیچ ہی میں دھجیاں اڑ جائیں گی
اِس طرف مسجد اُدھر مندر، چلی ٹھنڈی ہوا

جب خفا تھیں اس کی یادیں حبس تھا دل میں بہت
پھر گھٹا گھر آئی بالآخر، چلی ٹھنڈی ہوا

○
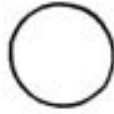
ہر طرف ریت نہ تھی راہ میں دریا تھے کئی
اس خرابے میں کبھی اپنے شناسا تھے کئی

اس کو دیکھا تو طبیعت نہ بھری دیکھنے سے
جگمگاتا تھا وہی یوں تو 'ستارا' تھے کئی

آئینہ کہتا تھا دھندلی ہے بصیرت میری
دل میں جھانکا تو وہاں عکس ہویدا تھے کئی

گرد اڑانے کا مزا آبلہ پا سے پوچھو
ورنہ بسنے کے لیے شہرِ تمنّا تھے کئی

لائقِ دید تھا منظر مری غرقابی کا
کوئی تنکا نہ بنا، محوِ تماشا تھے کئی

وہ جو کھلتے ہی نہ تھے دُزدِ حنا کی مانند
شعر سنتے ہی مرے آگ بگولا تھے کئی

○

جلوہ بھی اس کا پردہ ہے۔ محرومی، محرومی
میں نے اس کو کب دیکھا ہے۔ محرومی، محرومی

وہ خوشبو کا چنچل جھونکا میں سوکھی ڈالی کا پھول
اس کا میرا کیا ناتا ہے۔ محرومی، محرومی

چاند نگر میں دھول اڑائی تارے تارے پھینکے جال
اب میری جھولی میں کیا ہے۔ محرومی، محرومی

فتح وظفر کے نقاروں میں اپنا پرچم اڑتا ہے
اندر کتنا سناٹا ہے۔ محرومی، محرومی

اک مجمع ہے چاروں جانب ماتم کرنے والوں کا
جو بھی ہے وہ چیخ رہا ہے۔ محرومی، محرومی

پیچھے میرے نقشِ کفِ پا جھلمل جھلمل کرتے ہیں
لیکن آگے کوہِ ندا ہے۔ محرومی، محرومی

○
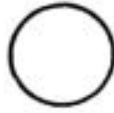
دھوپ نے کھیت کیا ہے مرے آنگن سے ادھر
کتنی مرجھائی ہوئی آگ ہے دامن سے ادھر

مل گئی تھیں مرے بچپن سے بڑھاپے کی حدیں
اور کچھ لوگ نہ آپائے لڑکپن سے ادھر

جیٹھ بیساکھ میں سیلاب ادھر آتے ہیں
ڈیرہ زردی نے جما رکھا ہے ساون سے ادھر

نخلِ اُمید میں کونپل ہی نہیں آپاتی
درد کی بادِ صبا سن سے ادھر سن سے ادھر

دل کی دھڑکن بھی اسی شور میں دب جاتی ہے
کون یہ چیختا ہے جلتے ہوئے بن سے ادھر

خار ہی بوتی رہی باغِ سخن میں تنقید
شعر کھلتے رہے تقطیع کی قدغن سے ادھر

○

مولا خشک آنکھیں تر کر دے
جھولی جھولی موتی بھر دے

شہپر دے بازو کٹنے پر
اونچا رہنے والا سر دے

انکھوے پھر سے پھوٹ رہے ہیں
زخمی ڈالی کو خنجر دے

آگ زنوں کے دل کو پانی
ہم بے گھر لوگوں کو گھر دے

خوشبو لٹ جاتی ہے ساری
رنگ نہیں ہم کو پتھر دے

مر جائیں گے بے تیشہ بھی
تیشہ دے تو دستِ ہنر دے

تتلی مانگ رہی ہے خوشبو
پھول دعا کرتے ہیں پر دے
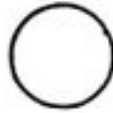
سر میں سما گئی تھی ہوا کج نہاد کے
ذرّوں نے بل نکال دیئے گرد باد کے

بے احتجاج ظلم کو سہنا روا نہیں
چپ رہ کے حوصلے نہ بڑھاؤ فساد کے

اُن کے سوا کسی پہ بھروسہ نہ کیجیو
وہ پَر تراش دیں گے ترے اعتماد کے

ہم نے تعلقات کی قلمیں لگائی تھیں
انکھوے یہ کیسے پھوٹ رہے ہیں عناد کے

جتنے گھروندے تم نے بنائے تھے ریت پر
پنجے گڑے ہیں ان پہ کسی دیو زاد کے

○

ہاں بادِ صبا سچ ہے پریشان رہے ہم
غنچوں کے بہر حال نگہبان رہے ہم

شبنم نے کیا پاک تو کانٹوں نے سیے چاک
ہر چند کہ مفلس کا گریبان رہے ہم

سر تا بقدم زخم ہیں اب کیسے بتائیں
گلدان رہے ہم کہ نمکدان رہے ہم

واللہ کہ بچنے کے لیے سر نہ جھکایا
ناوک فگنی کے لیے آسان رہے ہم

بسمل تھے مگر رقص کیا، رنگ اڑائے
دنیا تری تفریح کا سامان رہے ہم

یہ کیا کہ جدھر دیکھیے خود ہی سے لڑے آنکھ
اس آئینہ خانے میں تو حیران رہے ہم

تھے خاک بسر کر مکِ شب تاب مظفرؔ
ظلمت میں تری ذات کی پہچان رہے ہم

○
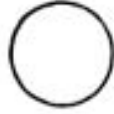
وہ گلدستوں میں اشعار لگاتا ہے
اور یہاں لہجے پر دھار لگاتا ہے

غرقابوں نے دیکھا دریا کا انصاف
زندہ مردہ سب کو پار لگاتا ہے

کون زمانے کو سمجھائے چلنے دو
چلنے والے ہی کو آر لگاتا ہے

کہلاتے ہیں دنیا بھر میں ظلِ اللہ
جن پر چھاتا خدمت گار لگاتا ہے

خوشبو قید نہیں رہ سکتی گلشن میں
دیکھیں وہ کتنی دیوار لگاتا ہے

ماضی سے تا حال مظفر ظالم ہی
تاج پہنتا ہے، دربار لگاتا ہے

○
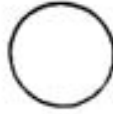
تمہیں وہ تابِ تگ و تاز ہی نہیں دیتا
ہمیں اجازتِ پرواز ہی نہیں دیتا

خدا کے فضل سے تہذیب آ گئی ہے اُسے
کسی کو دعوتِ شیراز ہی نہیں دیتا

ترے سوا جو کوئی میرے دل کو چھیڑتا ہے
عجیب ساز ہے آواز ہی نہیں دیتا

مرا وجود ہے اظہار کے لیے بیتاب
زمانہ موقعۂ آغاز ہی نہیں دیتا

ستم ظریفی تو دیکھو کہ تخت و تاج کے ساتھ
وہ بعض لوگوں کو دمساز ہی نہیں دیتا

مظفر اہلِ نظر بے خبر نہیں کہ خدا
سزا بھی دیتا ہے اعزاز ہی نہیں دیتا

○
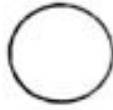
(عین رشید کی یاد میں)

اب اتنا بُرد بار نہ بن میرے ساتھ آ
بدلیں گے مل کے چرخِ کہن میرے ساتھ آ

پیوندِ خاک ہونا ہے بارے ابھی نہیں
پھیلا ہوا ہے نیل گگن میرے ساتھ آ

پلکیں بچھی ہیں میری ہر اک موجِ آب میں
اس پالکی پہ چاند کرن میرے ساتھ آ

اے روحِ بے قرار، ابھی جان مجھ میں ہے
زخموں سے چُور چُور بدن میرے ساتھ آ

ویسے بھی اپنے دستِ ہُنر کھا رہے ہیں زنگ
پھیکا پڑا ہے رنگِ چمن میرے ساتھ آ

سچ بولنے کا تجھ کو بڑا اشتیاق ہے
اچھا تو سر سے باندھ کفن میرے ساتھ آ

یاروں نے انقلاب تو نیلام کر دیئے
اب چھوڑ کر یہ دار و رسن میرے ساتھ آ
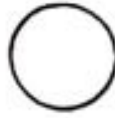
(عین رشید کی یاد میں)

مرے بھی شانے پہ ہے ایک سر زیادہ نہیں
مگر عزیز مجھے بال و پر زیادہ نہیں

ذرا سی بات پہ واویلا اس قدر نہ کرو
جلے ہیں شہر میں دو چار گھر زیادہ نہیں

میں اپنی ذات کے اندر غریقِ رحمت ہوں
اگرچہ میرے جہازی سفر زیادہ نہیں

خفا ہیں دوست انھیں کس طرح منائیں ہم
ترے گہر بھی تو اے چشمِ تر زیادہ نہیں

ہر ایک سمت اُجالا دکھائی دیتا ہے
پلک پہ ہے تو لہو بوند بھر، زیادہ نہیں

تری نظر میں سرافرازی جُرم ہے لیکن
ہمارے بچّوں میں نیزوں کا ڈر زیادہ نہیں

جنھیں زمانے میں ہر شخص غیر لگتا ہے
انھیں کے پاس مظفر نظر زیادہ نہیں

○

وہ ایک چہرہ گلاب میں ماہتاب میں بھی
اُسی کو دیکھا ہے جاگتے میں بھی خواب میں بھی

سوال کرتے ہوئے کہاں مسکرائے تھے ہم
گوارا کرنی پڑے گی تلخی جواب میں بھی

بنا کسی احتجاج کے ظلم سہہ لیا ہے
لکھا گیا ہے یہ جُرم تیرے حساب میں بھی

میاں تری تاک میں ہے یہ پُر فریب دنیا
اگرچہ پانی جھلک رہا ہے سراب میں بھی

ہر ایک طوفان کے مقابل اٹھائے ہے سر
کسی نے کیسی ہوا بھری ہے حباب میں بھی

طلسمِ حیرت سے کم نہیں وہ نظر مظفر
خمار ہے التفات میں بھی عتاب میں بھی

○
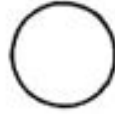
خبر ملی ہے کہ دریا بھنور بناتا ہے
کہاں ہے پانی میں جو رہگزر بناتا ہے

سُلگ رہے ہیں یہاں ریگ انتظار میں لوگ
کہ گرد بادِ کسے ہمسفر بناتا ہے

چراغِ شام مٹاتا ہے جس اندھیرے کو
چراغ کو تو وہی معتبر بناتا ہے

ہَوا تھمی ہے نہ برسات کو ترس آیا
نہ جانے کب سے وہ کاغذ پہ گھر بناتا ہے

عجیب جذبہ ہے نفرت کہ آدمی اکثر
اسی کو تیغ اسی کو سپر بناتا ہے

چھلک نہ جائے مظفر یہ قیمتی آنسو
یہی شرارہ تو شعروں کو تر بناتا ہے

○
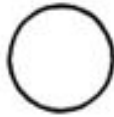
سپاٹ راہوں سے اتنے بیزار ہو گئے ہم
کہ گمشدہ اور تیز رفتار ہو گئے ہم

مجادلہ گھوم گھوم کر خوب کر لیا ہے
اُتاریئے چاک سے کہ تیار ہو گئے ہم

گھما پھرا کر اُسی کی باتوں سے ہو گئے شعر
اُسے تصوّر میں لائے سرشار ہو گئے ہم

جیئے تو ایسے کہ موت شرمندہ ہو رہی ہے
نہ آیا کوئی ہُنر تو فنکار ہو گئے ہم

وہ ہم کہ کُل کائنات کے راز جانتے ہیں
مگر خود اپنے لیے پُر اسرار ہو گئے ہم

ڈبونے والوں سے کوئی شکوہ نہیں مظفر
مزا تو یہ ہے کہ ڈوب کر پار ہو گئے ہم

○
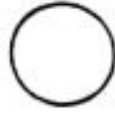
یہاں عدو کے سوا کون پوچھتا ہے ہمیں
لہولہان سہی کچھ نہیں ہُوا ہے ہمیں

ابھی تو سر ہی ابھارا تھا ہم نے دلدل سے
پتہ چلا کہ سمندر بُلا رہا ہے ہمیں

خوشا کہ غنچوں کو بادِ صبا بلاتی ہے
بُلا سے لُو کا تھپیڑ جلا چکا ہے ہمیں

تمہارے غم سے چراغاں کیا ہے سینے کو
کہ ہر طرف سے اندھیرا بہت ملا ہے ہمیں

خفیف رہتے ہیں اکثر ضمیر کے آگے
یہ تو نے کیسے ترازو پہ رکھ دیا ہے ہمیں

نپٹ گئے ہیں مظفرؔ پچاس ساٹھ برس
مذاقِ شعر و ادب ہے کہ گھُن لگا ہے ہمیں

مزے سے گن ستارے چھت نہ ہو تو
سمندر کیا اگر وسعت نہ ہو تو

کہا ٹھنڈی ہوا سے کیکٹس نے
ادھر بھی آئیو زحمت نہ ہو تو

تمہیں بھی آگیا خیرات کرنا
کوئی فتنہ سہی، آفت نہ ہو تو

بہاروں میں نہیں اٹھتے بگولے
جنوں کیا کیجیے وحشت نہ ہو تو

کبھی سوچا کہ ہم کس حال میں ہیں
کوئی شعر آپ کی بابت نہ ہو تو

ہمارا آسماں بھی چھین لیتے
مگر وہ کیا کریں قدرت نہ ہو تو

مظفر وردِ سر ہے شاعری بھی
کسی ہمدرد کی حاجت نہ ہو تو

○
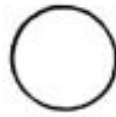
بشر کے ہاتھ متاعِ عزیز آئی ہے
کئی ہزار برس میں تمیز آئی ہے

ہر ایک پھول ہے فانوس کی حفاظت میں
بہار اب کے نہایت دبیز آئی ہے

نہیں، گلاب پلٹ کر ابھی نہیں آیا
لہو لہان کوئی اور چیز آئی ہے

کھڑے ہیں دھوپ کے پرچم تلے در و دیوار
سمجھ رہے تھے محل میں کنیز آئی ہے

کسی کے آگے مظفرؔ نے سر جھکایا نہیں
نہ اونچ نیچ کی اس کی تمیز آئی ہے

○
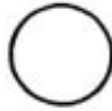
شکست ان کی ہوئی، نہ ہو گی کہ مورچوں پر اَڑے ہوئے تھے
جوان لاشے بغیر دفنائے خندقوں میں پڑے ہوئے تھے

وہ ایک مظلوم شاہزادہ کہ تشنہ لب بھی تھا فاقہ کش بھی
جُڑا تھا سونے کا تاج سر پر، بدن میں ہیرے گڑے ہوئے تھے

مقامِ عبرت ہے آپ کو بھی دکھائی پڑتے ہیں پستہ قامت
ہمارے شانے پہ بیٹھ کر ہی جنابِ عالی بڑے ہوئے تھے

سراب ہے، آبجُو ہے، کیا ہے، ادھر یہ تکرار ہو رہی تھی
بغاوتوں کے عَلَم اڑاتے ادھر بگولے کھڑے ہوئے تھے

طمانچے بجلی لگا رہی ہے گھٹائیں پیہم گھڑک رہی ہیں
یہی ہے وہ آسمان جس پر تمام تارے جڑے ہوئے تھے

چمن کا وہ ہولناک منظر کہ باغبانوں میں چل رہی تھی
درختوں پر چڑھ گئی تھی دیمک، طیور کے پر جھڑے ہوئے تھے

○

چراغ اپنے ہوا دینے سے پہلے
جلانے تھے بجھا دینے سے پہلے

میاں کیا لازمی تھا خاک اڑانا
کسی کو راستا دینے سے پہلے

نسیم صبح کو آیا پسینہ
خزاں کو بددعا دینے سے پہلے

ملا سکتے ہو کیا ہم سے نگاہیں
بغاوت کی سزا دینے سے پہلے

مناسب ہے کہ پڑھ لی جائے تختی
کسی در پر صدا دینے سے پہلے

ہمارا ہارنا طے ہو چکا تھا
تمہارے ہاتھ اٹھا دینے سے پہلے

سخی مشہور تھے ہم بھی مظفر
مگر سب کچھ لٹا دینے سے پہلے

○
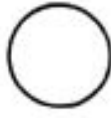
جہاں زمیں ہے وہاں آسماں بھی پڑتا ہے
یہ پردہ تیرے میرے درمیاں بھی پڑتا ہے

کوئی بتائے سفینے جلانے والوں کو
کہ اک اَنا کا سمندر یہاں بھی پڑتا ہے

مزا تو آتا ہے مر مر کے زیست کرنے میں
کبھی کبھار یہ سودا گراں بھی پڑتا ہے

حسین چہروں پہ ہم سینک لیتے ہیں آنکھیں
بَلا سے کم نظری کا دھواں بھی پڑتا ہے

اب اتنا خوش بھی نہ ہو ڈھا کے چار دیواریں
بدن فصیل میں اک شہرِ جاں بھی پڑتا ہے

ترے نثار، کچھ اتنا کیا ہے سرافراز
کہ سر سے نیچے ترا آستاں بھی پڑتا ہے

میں اپنی ذات کی پیچیدگی سے عاجز ہوں
اسی میں ورطۂ کون و مکاں بھی پڑتا ہے

○

میاں یہی ہے نظامِ ہستی، چلو یہاں سے
وگرنہ رونا پڑے گا حنفی، چلو یہاں سے

یہی تو ہونا ہے ایک بے نور صبح ہوگی
پھر ایک بے کیف شام ہوگی، چلو یہاں سے

اب اور کب تک منافقوں سے منافقت میں
بہت ہوا اب اُچٹ گیا جی، چلو یہاں سے

نہیں تو کیوں بال و پر لرزتے ہیں بے ارادہ
گرایا جائے گا یہ شجر بھی، چلو یہاں سے

ہوا چلی ہے ہرے درختوں سے دشمنی کی
ہمیں بھی آلے گی سُرخ آندھی، چلو یہاں سے

نہ جانے کب آئے اُن کی راحت کا کیا بھروسا
گلے گلے آچکا ہے پانی، چلو یہاں سے

یہاں کسی سے چُھپا نہیں جس طرح گزاری
وہاں کہیں گے کہ خوب گزری، چلو یہاں سے

میرے سچ کا تیری خود رائی بُرا مانتی ہے
تجھ کو دنیا بھی مرے بھائی بُرا مانتی ہے

کھڑکیاں کھولیں تو در آتا ہے سیلاب صدا
بند کیسے کریں پُروائی بُرا مانتی ہے

لائقِ دید ہے حالت مرے غم خانے کی
چاندنی چھٹکے تو انگنائی برا مانتی ہے

یوں تو جلوے نظر آتے ہیں ترے ہر شے میں
آئینہ بندی کو یکتائی بُرا مانتی ہے

ماند پڑ جائیں گی یادیں جو بچا رکھی ہیں
رونا ممکن نہیں، تنہائی بُرا مانتی ہے
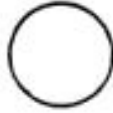
راستے نکلے مگر مفقود ہونے کے لیے
ہم سفر گرتے رہے نابود ہونے کے لیے

اسمِ اعظم اس کا لوحِ دل پہ کندہ ہے تو ٹھیک
ورنہ ساری کاوشیں بے سُود ہونے کے لیے

ہم سبھی کو اس نے بال و پر عطا فرمائے ہیں
آسمانوں کے تلے محدود ہونے کے لیے

چاہتا ہوں ان میں اپنے واسطے کچھ التفات
اُس کی آنکھیں ہیں خمار آلود ہونے کے لیے

اور پھر اِک روز اس نے بھی کنارا کر لیا
میری ہر تنہائی میں موجود ہونے کے لیے

میر کو پڑھیے اگر بنجر میں نم درکار ہو
میری غزلیں موم سے بارود ہونے کے لیے
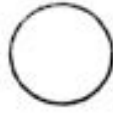
ذہن میں لاوا سا پکتا ہے کچھ
دل میں ہر وقت کسکتا ہے کچھ

میری قسمت کا ستارا تو نہیں
وہ جو رہ رہ کے چمکتا ہے کچھ

زرد چہرے پہ لکھا ہے کچھ اور
اور آنکھوں سے چھلکتا ہے کچھ

ہم تو مٹی پہ ہی آسودہ تھے
مسندِ گُل میں کھٹکتا ہے کچھ

وہ ظفریاب نہیں ہو سکتا
وار کرنے میں جھجکتا ہے کچھ

آسماں تان رکھے ہیں میں نے
پاؤں کے نیچے سرکتا ہے کچھ

اک زمانہ ہے مظفرؔ کے خلاف
نہ سمجھتا نہ لچکتا ہے کچھ

○

یہ چمک زخم سر سے آئی ہے
یا ترے سنگِ در سے آئی ہے

رنگ جتنے ہیں اس گلی کے ہیں
ساری خوشبو ادھر سے آئی ہے

سانس لینے دو کچھ ہوا کو بھی
تھکی ہاری سفر سے آئی ہے

دینا ہوگا خراج ظلمت کو
روشنی سب کے گھر سے آئی ہے

نیند کو لوٹ کر نہیں آنا
رُوٹھ کر چشمِ تر سے آئی ہے

آپ کو کیا خبر کہ شعروں میں
سادگی کس ہنر سے آئی ہے

○

اب روز یہی ہونا ہے ماتم نہ کرو تم
مقتول سب اپنے ہیں میاں غم نہ کرو تم

مرنے کی دعا مانگنے والوں سے تو پوچھو
جینے کا ابھی عزم مصمّم نہ کرو تم

نم آنکھوں سے کیا دیکھ رہے ہو مری حالت
از راہِ کرم آگ مری کم نہ کرو تم

جو پھول تر و تازہ ہیں نہلاؤ انھیں کو
کانٹوں کو عطا قطرۂ شبنم نہ کرو تم

دنیا سے جو ملنا تھا وہ سب مل ہی چکا ہے
کیوں دین کو دنیا پہ مقدّم نہ کرو تم

سر تا بہ قدم زرد نہیں ہو گے مظفر
شعروں کو اگر خون فراہم نہ کرو تم

○

گرہ باز جو تھا وہ پر بند ہے
زمانے میں کارِ ہنر بند ہے

لہو کے نشانے پہ ہوں ان دنوں
کئی دن سے میری شکر بند ہے

تمہارے سوا کچھ نہیں سوجھتا
کچھ ایسی مری چشمِ تر بند ہے

عدو اپنے شہ کو گھماتے رہیں
ہمارے پیادے کا گھر بند ہے

مہینوں سے اخبار دیکھا نہیں
کھلا ہے کہ توبہ کا در بند ہے

جدائی کی شب اور اس کا خیال
پیالی میں گہرا نظر بند ہے

مظفر کئی شاعروں کے تئیں
غزل شاعری کا کمر بند ہے

○

وہ ہٹتے تھے کنارے سے نہ دریا پار کرتے تھے
مگر ہر بلبلے ہر موج سے تکرار کرتے تھے

نہ جانے کیوں مرا گھر جل رہا ہے اور وہ خوش ہیں
یہی ہمسائے کل تک مجھ سے بیحد پیار کرتے تھے

دلوں میں چور سا تھا کچھ کہ آدم خور سا تھا کچھ
نہ وہ اظہار کرتے تھے نہ ہم اظہار کرتے تھے

جُھلستی ریت میں زندہ گڑے ہو کیا ہوا تم کو
تمہارے ہاتھ پر بیعت کبھی منجدھار کرتے تھے

ہماری راہ میں دیوار کی مانند حائل ہیں
وہ جن کے واسطے ہم راستے ہموار کرتے تھے

گھنے چھتنار پیڑوں کے لیے مشہور جنگل میں
ذرا سی چھاؤں پر پتّے بہت پیکار کرتے تھے

مظفرؔ کیا ہوئے وہ لوگ دنیا اُن کے دم سے تھی
جنھیں حاصل نہ تھی قدرت مگر ایثار کرتے تھے

○
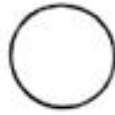
پیار شبنم کی بوندیں جتاتی رہیں
نیم کی پتیاں تلملاتی رہیں

سچ کی آواز تو گھونٹ دی آپ نے
عمر بھر کان میں چیخیں آتی رہیں

ساری چھوٹی بڑی جھیلیں اپنی جگہ
آئینے سورجوں کو دکھاتی رہیں

لوگ جھوٹوں پہ موتی لٹاتے رہے
کھوکھلی سیپیاں غم مناتی رہیں

ایک لڑکی کے ارمان لٹتے رہے
اور سب لڑکیاں گیت گاتی رہیں

شرم سے ڈوبنے والا کوئی نہ تھا
سب نے دیکھا انھیں، وہ نہاتی رہیں

کیوں مظفر نہیں سو سکے رات بھر
کس کی یادیں تمہیں گدگداتی رہیں

○

وہ مہرباں ہوا تو فضا ہی بدل گئی
صحرائے جاں کی آب و ہوا ہی بدل گئی

دریا تو بہہ رہا ہے اُسی آن بان سے
کشتی میں آ کے موجِ بلا ہی بدل گئی

محسوس کیجیے تو بڑی بات ہے میاں
منزل ملی تو بانگِ درا ہی بدل گئی

محفل میں جاں نثار کوئی ایک بھی نہیں
تیری نگاہ و طرزِ ادا ہی بدل گئی

چٹکی کوئی کلی نہ کہیں تتلیاں اڑیں
یہ رُت کھلے کھلائے بنا ہی بدل گئی
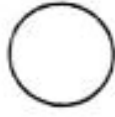
زخموں کا عالم انگوری جیسا کچھ
اور نمک اپنی مجبوری جیسا کچھ

نافہ وافہ میرے اندر خاک نہیں
مہکا کرتا ہے کستوری جیسا کچھ

اب تو تم بھی یاد بہت کم آتے ہو
جینا لگتا ہے مزدوری جیسا کچھ

مرتے دم تک دوزخ اس کے ساتھ رہی
اس خاکی میں تھا تو نوری جیسا کچھ

سوزش بڑھ جائے گی میرے چھالوں کی
رکھتے ہیں مرہم کافوری جیسا کچھ

یوں تو اس نے عرضی کر لی ہے منظور
لہجے میں ہے نامنظوری جیسا کچھ

کہتی ہے اس بھوکے بچے کی مسکان
دھیان میں آیا حلوہ پوری جیسا کچھ

اچھا اب ہم آنکھیں موندے لیتے ہیں
لگتا ہے پیغام ضروری جیسا کچھ

○

چراغ اپنے سنبھالو ہوا کی زد پر ہیں
میاں کمال تمہارے اَنا کی زد پر ہیں

بتایا چاؤ سے ٹھنڈی ہَوا نے کلیوں کو
کہ آپ لوگ سِنانِ قضا کی زد پر ہیں

اب اُن کا مال ہی کیا جان بھی نہیں بچتی
وہ رہزنوں کی نہیں رہنما کی زد پر ہیں

زمین تنگ پڑی میرے پاے وحشت کو
تو اب خلائیں مرے نقشِ پا کی زد پر ہیں

لطیفہ یہ ہے کہ بجلی جنھیں جلا نہ سکی
وہ آشیانے شمیم و صبا کی زد پر ہیں

مدد ، مدد ، کوئی طوفان ، کوئی موجِ بلا
ہمیں بچاؤ کہ ہم ناخدا کی زد پر ہیں

اس عہدِ نَو میں مظفر ہمیں تو لگتا ہے
کہ ارتقا میں بھی تحت الثریٰ کی زد پر ہیں

○
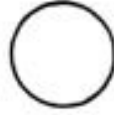
غم سمندر بیچ ہوں، رستا نکالے
کوئی خضر آئے، کوئی موسیٰ نکالے

چاند، تارے، پھول، تتلی، اوس، جگنو
راستے اظہار نے کیا کیا نکالے

دل سے اس کی یاد کیسے محو کر دوں
کیوں انگوٹھی سے کوئی ہیرا نکالے

اس کو بھی اک دن نگل جائے گی دھرتی
عمر بھر دھرتی سے جو سونا نکالے

پوچھیے ہم سے کہ خشک آنکھوں سے اپنی
کیسے ریگستان سے دریا نکالے

درد کے رشتے عداوت سے بڑے ہیں
آئے، کانٹے سے کوئی کانٹا نکالے

لاج رکھ لی اس طرح مظلومیت کی
سر کٹے تو ہم نے دو بارا نکالے

○

ہمیں پتہ ہے خزینہ نہیں نکلنے کا
ترے بدن سے پسینہ نہیں نکلنے کا

بیاضیں اور کتابیں ہیں کام آئیں تو
ہمارے گھر سے دفینہ نہیں نکلنے کا

انھیں نہ چھیڑیو، خوشبو اگر نہیں درکار
گلوں سے کوئی نگینہ نہیں نکلنے کا

تری مریضِ اَنا پستیوں میں اُترے گی
بلندیوں پہ یہ زینہ نہیں نکلنے کا

کوئی بھی صنفِ ادب ہو کسی زبان کی ہو
کہیں غزل سا قرینہ نہیں نکلنے کا

کنارا ہے یہ مظفرؔ نہیں کوئی گرداب
یہاں سے بچ کے سفینہ نہیں نکلنے کا

○

ریت آنکھوں میں اتنی ہے کہ رو بھی نہیں سکتا
رونے کا اثر آپ پہ ہو بھی نہیں سکتا

یہ کہہ کے ستم گر نے مرے کاٹ دیئے پاؤں
کانٹے تری راہوں میں تو بو بھی نہیں سکتا

سینے میں لگی آگ عطا کردہ ہے دن کی
بارُود بھری رات میں سو بھی نہیں سکتا

بہتی رہے گنگا مرا انعام یہی ہے
جو ہاتھ نہیں ہیں انھیں دھو بھی نہیں سکتا

جلنے کی قسم کھائی ہے مٹّی کے دِیے نے
تیز آندھی کا محکوم وہ ہو بھی نہیں سکتا

دھرتی کو پسینے کی یہ بوندیں ہی بہت ہیں
کھیتوں میں ستارے کوئی بو بھی نہیں سکتا

پیچیدہ ہیں اس دور میں مضمون غزل کے
موتی سے کوئی میرؔ پرو بھی نہیں سکتا

○

ہزاروں میں سے کچھ شمعیں بجھا دی جائیں تو کیا ہے
میاں جی ! روشنی کا اس طرف سے بھی تقاضا ہے

کہا پھر فون پر ماں سے کہ راوی عیش لکھتا ہے
سمندر پار میرا حال کیا ہے کس نے دیکھا ہے

اُجالے کے نمائندے نئی تاریخ لکھتے ہیں
جلائی ہیں کچھ اتنی بستیاں ہر سُو اجالا ہے

کیا ہے جس قدر محسوس اتنی گھٹ گئیں سانسیں
پڑھا جتنا زیادہ بوجھ اتنا سر پہ رکھا ہے

ستارے ڈھالتے ہیں چاند سورج ہم بناتے ہیں
ہمارے گھر میں صدیوں سے اندھیرا ہی اندھیرا ہے

ترے لب کے ستائش گر ہیں یہ جگنو بھی تتلی بھی
شرر جگنو کے جھوٹے، تتلیوں کا رنگ کچّا ہے

مظفرؔ روند کر آگے نکل جاؤں گا اس کو بھی
ترا شہرِ تمنّا کیوں مرے رستے میں آتا ہے
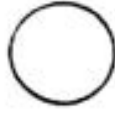
ہم غریبوں پہ جتنے ستم ڈھائیں گے
ایک دن آپ کے سامنے آئیں گے

سازشیں کرنے والے مرے قتل کی
راہ میں پھول بھی پھینکتے جائیں گے

خون اتنا بہایا گیا ہے یہاں
اب کے بادل بھی انگارے برسائیں گے

آسمانوں پہ یلغار ہو گی کبھی
لوگ اپنے پہ کب تک ترس کھائیں گے

پتھروں کو نہیں آئینوں سے خطر
آئینے کیسے پتھر سے ٹکرائیں گے

دل میں اتنی کدورت نہ پالا کرو
اگلی نسلوں کو مُنہ کیسے دکھلائیں گے

○

قطرے خوں کے دیدۂ تر میں کرتے کیا
یہ باغی واویلا گھر میں کرتے کیا

جس غنچے کو دیکھا اس کا دامن چاک
ہم بھی رہ کر بال و پر میں کرتے کیا

چھت کے نیچے سر کیسے اُٹھ سکتے تھے
قیدی تھے دیوار و در میں کرتے کیا

جس بستی میں سب خوابوں کے دشمن ہوں
تارے بو کر اس بنجر میں کرتے کیا

باغ اُجاڑے، فصلیں روندیں، گرد اُڑائی
کچھ کرنا تھا، اور سفر میں کرتے کیا

کاغذ پر کچھ پھول کھِلائے شعروں کے
چھالے میرے دستِ ہُنر میں کرتے کیا

○
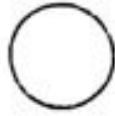
اس کی دہلیز پہ فردوس بریں اپنی تھی
سر اٹھایا تو نہ آنکھیں نہ جبیں اپنی تھی

یہ فلک بوس عمارت ہمیں پہچانے کیا
انھیں اطراف میں بنیاد کہیں اپنی تھی

آسماں ٹوٹ گیا ہاتھ بڑھائے جو ذرا
ٹوٹ کر جس پہ گرا ہے وہ زمیں اپنی تھی

خوش گمانی جو ہوئی چور تو کیا دیکھتے ہیں
تر بتر خون میں دیوارِ یقیں اپنی تھی

چین اس کو بھی نہ آتا تھا مظفرؔ کے بغیر
وہ بگولا تھا جہاں خاک وہیں اپنی تھی

○

آ لگی ہیں داستانیں خاتمے پر
گنگ لفظوں کی زبانیں خاتمے پر

اوّلاً پرچم تلے تیروں کی بارش
چار سُو ٹوٹی کمانیں خاتمے پر

راستے میں خون کا دریا پڑا تھا
اور لرزیدہ چٹانیں خاتمے پر

روزِ اوّل کان میں پھونکی گئی تھیں
پھر سنائی دیں اذانیں خاتمے پر

سربسر بے سُود لگتی ہیں مظفرؔ
آسمانوں کی اُڑانیں خاتمے پر

○
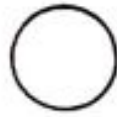
ہمیں چست و نادر قوافی ملے
مضامین تازہ بھی کافی ملے

پرو لیجیے اس کو اشعار میں
جہاں کوئی جذبہ اضافی ملے

مزے سے بھٹکتے رہے راہرو
انھیں راستے اختلافی ملے

ملے حامدی کاشمیری، مگر
وہ تنقید میں اکتشافی ملے

بھروسہ کسی پر تو کرنا ہی تھا
سبھی راز داں انحرافی ملے

مرے یار کیا چاق و چوبند ہیں
کوئی موقعۂ موشگافی ملے

مزا دے رہا ہے نیا قافیہ
یہ کرنل معمّر قذافی ملے

بہت ہو چکی شاعری واعری
مظفرؔ میاں اب معافی ملے
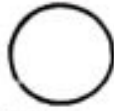
پھول کانٹے بنا تو نکلتا نہیں
وہ عدو سے جدا تو نکلتا نہیں

ہم بھی کرتے نہیں اب شجر کاریاں
کوئی پودا ہرا تو نکلتا نہیں

مٹھیاں کھول کر تم نے اچھا کیا
ورنہ دُزدِ حنا تو نکلتا نہیں

دشت میں دھول اُڑانے سے کیا فائدہ
آپ سے راستا تو نکلتا نہیں

کھینچ لیتے اگر خار ہوتا کوئی
دل کا یہ آبلہ تو نکلتا نہیں

شہر یاری کا گُر اُس کو معلوم ہے
شہر میں کچھ ہُوا تو نکلتا نہیں

پھر یہ آہ و بُکا ہر طرف کس لیے
گھر سے وہ دلربا تو نکلتا نہیں

عمر ہی کھپ گئی راستے میں ترے
اب مرا نقشِ پا تو نکلتا نہیں

تازہ پرچوں میں غزلیں پڑھیں سیکڑوں
شعر کوئی نیا تو نکلتا نہیں

○

سنا ہے اس طرف اک وادیِ پرخار آتی ہے
ہماری آبلہ پائی سبک رفتار آتی ہے

معلق ہو اگر کانٹے پہ کوئی قطرۂ شبنم
تو دل دریا میں طغیانی ہزاروں بار آتی ہے

پڑا ہے امن کا لشکر مرے دروازے کے باہر
کھلی کھڑکی سے گھر میں خون کی بوچھار آتی ہے

ستارے آنکھوں میں زخموں میں جگنو ٹمٹماتے ہیں
مرے ماتم کدے میں چاندنی بیکار آتی ہے

ہمیں اتنی زیادہ مل گئی پندار کی دولت
کہ قسمت کا گلہ کرتے ہوئے بھی عار آتی ہے

چلیں اب اس خرابے میں ہمارا جی نہیں لگتا
یہاں سایہ چرانے کے لیے دیوار آتی ہے

مظفر ہم غزل کہتے ہیں اک مخصوص لہجے میں
پرت پڑتی ہے معنی میں زباں میں دھار آتی ہے

○

تخریب کی جانب انھیں مائل نہ کیا جائے
خودداروں کو سنگینوں سے قائل نہ کیا جائے

اک ایسی گزرگاہ بنے آنکھ سے دل تک
جس بیچ سمندر کوئی حائل نہ کیا جائے

کانٹے تو شگوفوں کی حفاظت کے لیے ہیں
کانٹوں سے کسی پھول کو گھائل نہ کیا جائے

سونے کا ملمع تو اُتر جائے گا خود ہی
غم نشّہ ہی ایسا ہے کہ زائل نہ کیا جائے

سچ ہے کہ گواہی کی ضرورت نہیں سچ کو
پابندِ براہین و دلائل نہ کیا جائے

(صوتی قافیوں میں)

یہاں تو جتنے برس گزارے عذاب یا احتیاط کے تھے
جو ہم سے کٹ کر نکل گئے ہیں وہ چار دن انبساط کے تھے

وہ فرشِ گل پر خرام فرما یہ راہرو پل صراط کے تھے
وصال کے لاکھ دن برابر فراق کی ایک رات کے تھے

نفس کو اپنے ضعیف کرتا ، انا کو اپنا حریف کرتا
مگر اسے فکر ہی نہیں تھی کئی وسیلے نجات کے تھے

رقابتوں نے نقابیں چہروں پہ ڈال رکھی تھیں مصلحت کی
بندھی تھی مٹھی منافقت کی معاہدے اختلاط کے تھے

ہزار لوگوں سے دوستی کی نہ ہو سکی خود سے آشنائی
عجب عناصر خمیر میں تھے عجیب اسرارِ ذات کے تھے

تمام بکھری ہوئی ہے زردی ہوا نے حالت خراب کر دی
یہاں بھی فصلیں خلوص کی تھیں وہاں بھی موسم نشاط کے تھے

لہو کی اِک بوند اے مظفر تھمی ہوئی نوکِ خار پر تھی
ادھر فنا گھات میں لگی تھی ادھر تقاضے حیات کے تھے
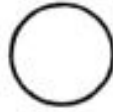
اِتنی نوکیلی کرنوں سے ہر پودا جل جائے گا
لیکن دس بارہ گھنٹوں میں سورج بھی ڈھل جائے گا

اُمّیدوں پر پھول آنے میں عمریں کھپ جاتی ہیں میاں
کیا سمجھے تھے نخلِ تمنّا دو دِن میں پھل جائے گا

بھونرا اتنا آزاد نہیں ہے پھولوں پر منڈلانے کو
ڈر ہے وہ پھولوں کے مُنہ پر رسوائی مَل جائے گا

آئے ہیں پُرزور تقاضے تُند مزاج سمندر کے
قرض ادا کرنے کو دریا سینے کے بَل جائے گا

کہتے ہیں اب رُت بدلے گی ڈالی ڈالی مہکے گی
دھرتی کا رس پتّے پتّے کونپل کونپل جائے گا

جان بچانی ہے تو خود ہی ٹال مظفر خطرے کو
پہرے دار بھی آجائیں جب خطرہ ٹل جائے گا

○

اِک دشتِ خطر میں آ گئے ہم
کس راہ گزر میں آ گئے ہم

ساحل پہ فساد ہو رہا تھا
بچنے کو بھنور میں آ گئے ہم

تم نے جو گرا دیا نظر سے
دنیا کی نظر میں آ گئے ہم

کچھ دھول اڑائی کہکشاں میں
پھر لوٹ کے گھر میں آ گئے ہم

اب خون سے سینچنا پڑے گا
مٹی کے اثر میں آ گئے ہم

روشن تھے چراغِ شب کے ہمراہ
کیوں دامِ سحر میں آ گئے ہم

دولت سے بچا کے اپنا دامن
ایوانِ ہنر میں آ گئے ہم

○
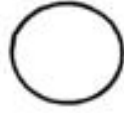
میں تو بن دیکھے بہل جاؤں گا لیکن تم لوگ
طوؔر کہتا ہے کہ جل جاؤں گا لیکن تم لوگ

خاک سے رابطہ رکھنا تمہیں منظور نہیں
مَیں تو مٹّی میں بھی رُل جاؤں گا لیکن تم لوگ

ڈگمگاتا جو نہیں ہے وہ سنبھلتا بھی نہیں
ڈگمگاؤں گا سنبھل جاؤں گا لیکن تم لوگ

تم بھی چڑھتے ہوئے سورج کے پجاری نکلے
اِک پہر اور ہے ڈھل جاؤں گا لیکن تم لوگ

خود ہی اِک شعلۂ جوالہ ہوں میرا کیا ہے
بجھ کے اس پار نکل جاؤں گا لیکن تم لوگ

قاعدہ ہے کہ پگھل جاتا ہے جلنے والا
روشنی دے کے پگھل جاؤں گا لیکن تم لوگ

○

کاروبارِ شوق مندا چل رہا ہے
خون میں اِک تار نیلا چل رہا ہے

وقت سے پہلے ہی کھل جاتی ہیں کلیاں
تتلیوں کا کام اچھا چل رہا ہے

حاشیہ آرائیوں سے دوستوں کی
سرخیوں میں نام اپنا چل رہا ہے

گرد اُڑنی چاہیئے اُڑتی رہے گی
سو گئے راہی تو صحرا چل رہا ہے

اور تنکوں نے کہا چھاتی پھُلا کر
جی، ہمارے دم سے دریا چل رہا ہے

اپنی راتیں بھی مزے میں کٹ رہی ہیں
آجکل مصرع پہ مصرعؔ چل رہا ہے

تھام رکھی ہے زمیں نے سانس اپنی
ایک بچہ ڈگمگاتا چل رہا ہے

لے دانستہ

○
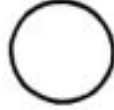
سیکھنا ہم سے اُجالے کو دیئے میں روک لینا
اور پھر اس کا ہمیں ہی راستے میں روک لینا

صبح پیہم دستکیں دیتی رہی دروازہ کھولو
اس طرف ہم سب کا چیخوں کو گلے میں روک لینا

آندھیوں سے میرا ہم آغوش ہونا جنگلوں میں
پھر بھنور بن کر وہ دریا کو مزے میں روک لینا

نقش پا سے پوچھ سکتے ہو مرے وہ کارنامے
ریت کے طوفان وحشت کے نشے میں روک لینا

کاٹ دینا میرا اُنا نام آئے جو اس کے تذکرے میں
بر سبیلِ تذکرہ کو تذکرے میں روک لینا

بتکدہ ویران، مسجد بند، کرفیو شہر میں ہے
غیر ممکن بادہ نوشی میکدے میں روک لینا

○
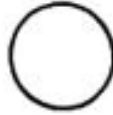
مَیں چراغِ سحر ٹمٹماتا ہُوا
بجُھ گیا تو زیادہ اُجالا ہُوا

دوسرے لوگ گھر پھونکنے آئے تھے
میرا دروازہ سیلاب پر وا ہُوا

قدر فردا کی کم ہوگئی حال میں
حال ماضی بنا تو سنہرا ہوا

میری آنکھوں میں بھی امن کا خواب ہے
سوختہ باپ دادا کا دیکھا ہوا

بلبلاتے تھے بچے وہاں بھوک سے
بستیاں جل گئیں تو بُرا کیا ہُوا

حال پوچھا نہیں ورنہ کیا کہتے ہم
اُس نے دیکھا نہیں اور اچھا ہُوا

○

دنیا میں خود کو سب سے اہم جانتے ہو تم
لیکن ہمارے بارے میں کم جانتے ہو تم

چلنے لگے تمہاری گلی میں اٹھا کے سر
جب سے سنا ہے طرزِ ستم جانتے ہو تم

مشہور مت کرو کہ تمہیں سچ پسند ہے
کیوں سر بریدہ ہیں یہ قلم جانتے ہو تم

گھاٹے میں آ نہ جائے عبادت کا کاروبار
سجدوں کو اپنے دام و درم جانتے ہو تم

تم سے گلہ نہیں ہے کہ خود اپنی ذات سے
کس درجہ شرمسار ہیں ہم جانتے ہو تم

دامن سے جھٹکی جاتی ہے کیسے خوشی کی گرد
کیسے اٹھائے جاتے ہیں غم جانتے ہو تم

دنیا کو جانتے ہو مظفرؔ میاں ولے
سب کچھ بقدرِ دیدۂ نم جانتے ہو تم

○

اِک آبشار تھا مجھ کو بہانے والا تھا
میں گردباد، اسے سر چڑھانے والا تھا

جنھوں نے آگ لگائی وہ مہرباں تھے مرے
میں اس خرابے کو خود ہی جلانے والا تھا

خبر ہے آج وہاں زندہ گڑ گیا کوئی
دکان اپنی جہاں میں لگانے والا تھا

اُسی کو باندھ کے پھینک آئے لوگ دریا میں
وہی تو شہر میں کشتی بنانے والا تھا

ترے دیار کی رونق سے کیا بہلتا جی
وہاں تو جو بھی ملا جی دکھانے والا تھا

پھر اُس کو یاد کیا اور میں نے مُوند لی آنکھ
کہ اُس کے بعد نظر کون آنے والا تھا

مجھے بکھرنا نہیں آیا پھول کی مانند
بس ایک کانٹا تھا اور ٹوٹ جانے والا تھا

○

پیغامِ صبا دل سے غم دُور کرے ہے گا
غنچے کو چٹکنے پر مجبور کرے ہے گا

ہر بات کو شدّت سے محسوس جو کرتا ہے
پاگل ہے خراشوں کو ناسور کرے ہے گا

اس کو بھی سمجھتے ہیں احباب سیہ کاری
اِک شخص مری راتیں پُر نور کرے ہے گا

قُرب اُس کا قیامت ہے ادنیٰ سی کرامت ہے
وہ اپنے تصوّر سے مخمور کرے ہے گا

رنجور تو کرتا ہے دل چُور تو کرتا ہے
لیکن وہ محبّت بھی بھرپور کرے ہے گا

اس کی تو ہر اِک مرضی، مرضی ہے مظفرؔ کی
وہ میری ہر اِک عرضی منظور کرے ہے گا

○

جھلملاتے ہیں ستارے آسماں کے تھال میں
ہم ادھر اُلجھے ہوئے اپنی رگوں کے جال میں

سولہ دلّی میں کٹے سترہ برس بھوپال میں
بارہ برساتیں گزاریں مغربی بنگال میں

آرزوئیں ہر قدم پر کہکشاں بوتی ہوئی
زندگی جکڑی ہوئی زنجیرِ ماہ و سال میں

سب کے اندر جاگزیں ہے اپنی رسوائی کا خوف
کس کو فرصت ہے کہ دیکھے کون ہے کس حال میں

دیکھنا سیلاب ہی چُومے گا راحت کے قدم
مُوشگافی ہو رہی ہے پُرسشِ احوال میں

آگ ہے پیروں کے نیچے، برگِ گُل اڑتے ہوئے
کچھ قلندر دیر سے مصروف ہیں دھمال میں

اے مظفرؔ گرم ہیں اشعار تیری آنچ سے
ورنہ جل بجھتے ہیں شاعر آتشِ سیّال میں
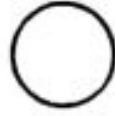
جب چاہا تلوار سمجھ کر مجھ کو استعمال کیا
حاکم ہی کیا دنیا بھر نے میرا استحصال کیا

گلشن پر جو کچھ بیتی ہے کوئی پوچھے تو بتلائیں
بادل نے کیا ہُن برسائے موسم نے کیا حال کیا

سورج نے پھیلا دیں کرنیں شبنم کی نابودی کو
موقع پا کر شبنم نے بھی سبزے کو پامال کیا

آوارہ خوشبو سے اس نے ہم تک پہنچایا پیغام
ہم نے بھی تتلی کے ہاتھوں اِک نامہ ارسال کیا

جیون کے تانے بانے میں یوں ہی کیا کم اُلجھن تھی
پھر اپنا ہمزاد جگا کر کیوں جی کا جنجال کیا

ہم تو برزخ ہو یا جنت اس کی مرضی میں خوش ہیں
جس کو دوزخ میں رہنا ہے اس نے قیل و قال کیا

○
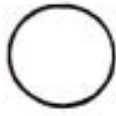
مظفر ابیات ڈھالتا ہے
کہ لعل و گوہر نکالتا ہے

ڈبونے والا ہے اور کوئی
سمندر اُوپر اچھالتا ہے

پہاڑ جس نے کھڑے کیے ہیں
وہ چیونٹی کو بھی پالتا ہے

ضرور روشن ضمیر ہوگا
جو دل کو غم سے کھنگالتا ہے

اُسے ضمانت نہیں ملے گی
وہ آنکھ میں آنکھ ڈالتا ہے

سرشت ہیں لغزشیں ہماری
کوئی تو ہے جو سنبھالتا ہے

چمک رہی ہے غزل مظفر
ستارے شعروں میں ڈھالتا ہے

نظمیں

لوح طلسم آب و باد

طفل فطرت نے اڑائے ہیں جو یہ ،

صابن کے لاکھوں بلبلے ،

ٹھوس بن کر اور نازک ہو گئے ہیں ،

عمران کی چند لمحے تھی ،

مگر لمحے وہ جامد ہو گئے ہیں ،

ہم انھیں لمحوں کو اپنی سانس کی گرمی سے ،

پگھلانے کی کوشش کر رہے ہیں ،

اور دقتی موت ناکامی کے ہاتھوں مر رہے ہیں۔

دوستو !

ہمت نہ ہارو ،

اِک نہ اِک دن ،

منجمد لمحوں کی قسمت میں پگھل جانا لکھا ہے۔

اس کے آگے ،

حضرت آدم کا جنت سے نکل آنا لکھا ہے

تجربہ

بدن گرم ہے اور جذبات سرد
لگاتی ہے چھاتی پہ
ماتھے کی بندیا
سناتی ہے شوہر کو
آجا ری نندیا
اسی غم میں مدقوق سا
زرد زرد
بہت ساری عورت کا
تھوڑا سا مرد !

بلیک آؤٹ کی تیسری آنکھ

خوف نے بازو بڑھائے ،
کھڑکیوں نے ڈر سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں ،
روشن دان ،
دروازے ،
سیہ ملبوس میں لپٹے کھڑے ہیں ۔
روشنی کونے میں دبکی رو رہی ہے ۔
روشنی ......
جو زندگی اور جہد پیہم کی علامت تھی ،
مسرت اور خوش آیند مستقبل کی ضامن تھی ،
ہمارے عہد میں ،
موت کی پیغام بر ہے !

جینا ہو تو

مارو اور مر جاؤ کا آدرش بھلا کر،

دم سادھے،

من مارے،

یوں ہی اپنے اپنے بھٹ میں یارو !

پڑے رہو چپ چاپ۔

آزادی کے سانس کی خاطر،

کھوہ سے سر باہر نکلا تو،

فولادی سیمرغ کے پنجے،

پھٹتا سورج،

کان کی کھوج میں اڑنے والا جلتا لوہا،

آوازوں کے بھاری پتھر،

مل کر حملہ آور ہوں گے !!!

اناالحق کی تفسیر

آگ پانی میں پڑی تو بجھ گئی۔

آگ پر پانی جو رکھا،

بھاپ بن کر اُڑ گیا۔

آگ میں مٹی جو ڈالی،

راکھ بن کر رہ گئی۔

آگ جب مٹی میں آئی، سرد تھی۔

آب و گل مل کر غلاظت بن گئے۔

آگ، پانی اور مٹی،

جب ہوا کے جال میں آئے،

تو انساں بن گئے۔

یعنی......

انسانی عناصر میں نمایاں وصف رکھتی ہے،

ہَوا!

لوہے کے راستے پر

وقت تھم کر رہ گیا تھا،
آئینے میں ایک دھندلا عکس جم کر رہ گیا تھا۔
داہنی جانب وہ لڑکی سو چکی تھی،
رات آدھی ہو چکی تھی۔
گم شدہ سیکنڈ کی سوئی کے غم میں،
اونگھتی سی جان پڑتی تھی کلائی پر گھڑی۔
تھپتھپاتا تھا کوئی لوہے کا ہاتھ۔
ذہن پر جالا سا بُن رکھا تھا سگرٹ کے دھوئیں نے۔
نیم خوابیدہ خیالوں نے یہ سوچا،
زندگی بھی سو رہی ہے۔
دفعتاً پُرشور ہچکولے کے ساتھ،
ایک اسٹیشن پہ گاڑی رک گئی،
اور باہر کی صدائیں کھڑکیوں کو توڑ کر اندر گھُس آئیں۔
تب خیال آیا،
کہ ہم تو بھاگتے آئے ہیں،
اسّی میل کی رفتار سے!

آج کی بات

میں نے مرحوم دادا کی تصویر سے
باسی پھولوں کا گجرا اُتارا ،
مہکتے ہوئے تازہ پھول ان کے چرنوں پہ رکھتے ہوئے ،
اچانک نگاہوں میں وہ کیل آ ہی گئی
جو اکھڑنے کو تھی ،
جس پہ مرحوم دادا کھڑے تھے مرے ۔
میں نے اس کیل کو ،
احتیاطاً ذرا زور سے جڑنا چاہا تھا ،
پتھر کی دیوار میں ۔
غالباً زاویہ کچھ غلط ہو گیا ۔
چوٹ میرے انگوٹھے پہ آ کر پڑی ،
اور مُنّا نے اِک قہقہہ جڑ دیا !

اسے دیکھ کر

ساری تہذیب جیسے ہوا ہو گئی۔
میں اسے دیکھ کر،
دیکھتا رہ گیا۔
جی میں آیا کہ سینے میں رکھ لوں اسے،
واقعی نامکمل ہے میرا وجود۔
مجھ سے چھینی گئی تھی جو روزِ ازل،
وہ یہی ہے۔
مری بائیں پسلی،
یہی ہے !!

ایک پرانی داستان کے بیچ میں

..... پھر گُلِ خورشید بھی مرجھا گیا،
ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔
اپنے اپنے طور پر،
سب ہی کوشاں تھے
کسی صورت ذرا سی روشنی ہو۔
جگمگائے مفلسوں کے دل
امیروں کے ایاغ،
اور یہ سارے چراغ،
ایک دو پَل ٹمٹما کر بجھ گئے،
لوگ مایوسی کی چادر تان کر سونے لگے
خشک سورج کی کلی پر،
خامشی کے ساتھ،
پیہم،
رات شبنم کی طرح گرتی رہی .....

اس کی سوچ کا سایہ

مستقبل میری گود میں ہے،
اور ماضی لیٹا گھانس کھا رہا ہے۔

یہ ضدی ہے،
وہ بیمار۔

سوچ رہا ہوں،
اس کو انجکشن لگوا دوں،
یا اس کو جوتے پہنا دوں،
دُور اندیشی کہتی ہے،
مستقبل کو ناراض نہ کر،
کل ماضی کے بستر پر تو لیٹا ہوگا۔
ماضی کہتا ہے:
بیٹا!
میں نے بھی یوں ہی سوچا تھا

رِستا ہوا بوسہ

میں نے اس کے تھرتھراتے ہونٹ پر،
کچھ اس طرح آہستگی سے،
رکھ دیئے تھے ہونٹ اپنے،
جیسے چوڑی پر کوئی چوڑی بٹھائے۔
ذہن میں ہلکی سی شیرینی کا خوش کن ذائقہ ہے۔
سانس میں خوشبو گھلی ہے،
شہد میں ڈوبی ہوئی چمپا کی پنکھڑیوں کا عالم،
پھر مرے احساس میں کیوں......
کانچ کا ٹکڑا سا چُبھ کر رہ گیا ہے،
میرے ہونٹوں پر،
یہ سُرخی کس لیے ہے؟!

جذبوں کا تصادم

آیئنے کے سامنے اک آیئنہ رکھ دیجیے ،

پھر دیکھیے ۔

ساتھ میں لیٹا ہوا بچّہ اگر سویا نہ ہو ،

نصف بہتر کو ذرا سا گود میں لے لیجیے ،

تجربہ تو کیجیے !

سونے کی کان کا حادثہ

جس کو مٹّی دے رہا ہوں ،
وہ مرا اِک دوست تھا ،
دوست ،
سونے سا کھرا۔
جس کے اخلاص و محبّت کی قسم کھاتے تھے سب۔
روزانہ ،
جو زمیں کی کوکھ میں جاتا تھا سونے کے لیے ۔
آج کے اس حادثے کے بعد ،
وہ ہاتھوں پہ سونا لے کے ،
شاید پھر نہ لوٹے گا کبھی ،
جس کو مٹّی دے رہا ہوں ....

فلسفے کے شہر میں

وہ دھارا کو کاٹ رہے ہیں
میں سیدھے سیدھے بہتا ہوں

وہ سکھ میں روتے رہتے ہیں
میں ہنس ہنس کر دکھ سہتا ہوں

وہ اپنی شہرت کے طالب
میں کھویا کھویا رہتا ہوں

وہ مجھ کو پاگل کہتے ہیں
مَیں ان کو پاگل کہتا ہوں

پاگل، چاند اور چور

وہ کنارے پر کھڑا تھا،

سامنے،

بے شکن، شفاف چادر سطح دریا کی بچھی تھی۔

چاند لیٹا سو رہا تھا۔

جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے،

ایک پتھر کھینچ مارا،

اور بھاگا۔

سیکڑوں ہاتھوں نے موقع پا کے،

پہلے چاند کے ٹکڑے چُنے،

بعدازاں چوری چھپانے کے لیے،

کہرام برپا کر دیا،

دیکھنا.....

جانے نہ پائے!

گوتم کا خط

اندر سے زنجیر چڑھا کر،
گیان کی خاطر "میں" بیٹھا تھا۔
تنہائی اور خاموشی کی،
لمبی لمبی شاخیں سر پر جھول رہی تھیں۔
اور اچانک ......
پوسٹ مین نے چٹھی پھینکی،
دروازے کی جھرّی سے۔
کورے ذہن میں رینگ آیا پھر ایک خیال۔
باہر نے پھر توڑ دیا اندر کا جال۔

وقت کی رہائی

میرے والد کو ،
شاید ان کے دادا نے ،
جانے کس قیدی لمحے میں ،
(میرا اندازہ ہے ان کی سالگرہ پر)
بھجوائی تھی ایک سنہری پاکٹ واچ !
جواب ان کے انتقال پر ،
ورثے میں مجھ تک پہنچی ہے۔
میں مرنے سے پہلے اس کو ،
(ایک ضرورت آپڑنے پر)
بیچ رہا ہوں۔
اور سوچتا ہوں خوش ہو کر ،
میں نے ورثے کا یہ حلقہ توڑ دیا ہے۔
بچوں کے صدقے میں اس قیدی لمحے کو چھوڑ دیا ہے !

جذبۂ بے نام کی پہلی فتح

کان میں سونے کی گھنٹی سی بجی
تھرکا رگِ جاں میں لہو۔
رفتہ رفتہ ہو گئی دل کو خبر،
ایک چھوٹی سی خوشی کی موج نے،
یہ ابتری پھیلائی ہے۔
اس نے آنکھوں کی طرف،
جذبۂ بے نام کی موجوں کا اک لشکر بڑھایا۔
اور اب .....
نوکِ مژگاں سرخ ہے۔

جھولنا حاتم کے سر کا....

....

اور حاتم طائی نے جب
اسمِ اعظم پڑھ کے
ان پر دم کیا۔
پیڑ پر لٹکے ہوئے سر،
گر پڑے تالاب میں
اپنے جسموں سے گلے مل کر،
نہایت خوش ہوا پریوں کا غول۔
مہ لقاؤں میں جو سب سے خوب تھی
شکریے کے طور پر حاتم سے ہم بستر ہوئی۔
یہ بدن ہی سے بدن کا تھا ملاپ،
جسم اور سر کا نہیں،
اس واسطے،
اسمِ اعظم کا اثر جاتا رہا۔
تب سے،
حاتم طائی کا سر،
جُھولتا ہے پیڑ پر۔
اور،
دھڑ تالاب میں ڈوبا ہوا ہے!

خوف در خوف

سرد ہواؤں نے پر تولے ،
جھینگر چپّی مکّی بولے۔
الّو چیخا ـــــ ہاؤں۔
کالی بلّی ـــــ میاؤں۔
کتّوں نے ملہار الاپا ویرانے میں ،
رات پھنسی ہے مکڑی کے تانے بانے میں۔
خوف نے ڈرتے ڈرتے ،
جوں ہی دل میں کروٹ لی ،
سنّاٹا بولا :
شی !

سندر سپنے کی تعبیر

میں نے اک سپنا دیکھا تھا ،
کیسا سندر سپنا تھا !
جیسے میری پہلی محبوبہ میرے گھر آئی ہے ۔
گڈو ، پپو ، منا ، ببلو ،
سب کو پاس بلا کر اس نے پیار کیا ہے ۔
مجھ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں ،
چاہت کا اقرار کیا ہے ۔
کیا ہی سندر سپنا تھا !
اب میں بھوگ رہا ہوں اپنے سندر سپنے کی تعبیر ،
وہ سچ مچ آئی ہے
(اپنے ساتوں بچوں کے ہمراہ)
عصّو (میری بیوی) سے مل کر بے حد مسرور ہوئی ہے ۔
عصّو کی کوشش ہے اس کی ناک نہ نیچی ہونے پائے ۔
مجھ کو یہ گھبراہٹ ۔ بنیا پیٹھ دکھا کر بھاگ نہ جائے !

فائلوں کا جادوگر

اس کے ہاتھ میں جادو ہے،
لاکھوں ایکڑ جنگل اس نے صاف کیا۔
سڑکیں بنوائیں،
سندر بنگلے،
ان گنتی تالاب، کنوئیں تعمیر کیے۔
باندھ بنا کر کھیتوں کو شاداب کیا۔
اربوں کی اسکیم کھڑی کی۔
لیکن اس کے اور اس کی کرنی کے بیچ،
کاغذ کی دیوار کھڑی ہے!

احساس کے زخم

کچھ دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا وہ پارک میں
میں نے اسے سلام کیا،
اُس نے غالباً،
دیکھا نہیں کہ ٹال دیا جان بوجھ کر۔
القصّہ وہ سلام معلّق ہی رہ گیا۔
سبزہ زمیں پہ لیٹ گیا قہقہے کے ساتھ،
ظالم ہَوا بھی پیٹ پکڑ کر پلٹ گئی۔
پتّوں نے تالیاں سی بجائیں،
کلی ہنسی۔
سنجیدہ کانٹے منہ کو بسورے کھڑے رہے!

انجیل کے ایک ورق کی تکمیل

مجھ کو گھیرے بھیڑ کھڑی تھی،
میں مجرم تھا۔
میں نے اصلی پیار کیا تھا،
ایک مجسم عورت سے۔
حکم ہوا سب مل کر مجھ پر،
پتھر برسا سکتے ہیں۔
لیکن یہ پابندی تھی:
پہلا پتھر وہ پھینکے گا،
جو اب تک معصوم رہا ہو۔
سب منھ تکتے کھڑے ہوئے تھے۔
میں نے خود ہی بڑھ کر،
ہر پتھر کو سر سے توڑ دیا!

کال کوٹھری

نہایت نفیس اور آرام دہ ،
چمک دار ، چکنا ، ملائم سہی ،
بہر حال ......
تیار کرتا ہے ریشم کا کیڑا ،
وہ اِک خول ،
محبوس رہنا ہے جس میں اسے حبس دم تک ۔
یہ رشتے ، یہ ناطے ،
من و تُو کے جذبے ،
نظریات اور فلسفے ،
علم و فن ،
فرائض ۔ عمل ۔ ارتقار ،
اور یہ ـــــ اور وہ
سوچیے تو ذرا ،
روح کے حبس دم کے لیے ،
ہم نے کتنا چمک دار ، چکنا ، ملائم سازنداں بُنا ہے !

وقت کے حمام میں

ٹھیک پندرہ سال بعد
وہ مجھے کل شام
اِک بھٹیار خانے میں ملا تھا۔
دیر تک اِک دوسرے سے ہم گلے ملتے رہے،
اور لنگڑی یاد کو سگرٹ سے سلگاتے رہے۔
اس نے کہا،
یاد ہے وہ اُونٹ،
جو انگلش پڑھاتا تھا ہمیں؟
وہ چنے کے کھیت والا واقعہ؟
رات میں گنّے کی چوری؟
دوپہر میں،
آم کے باغوں پہ ڈاکے؟
اور لوگوں کا ہمیں ہم زاد کہنا،

یاد ہے ؟

مسکرا کر میں نے اپنا سر ہلایا اور پوچھا :

کیا تمہیں بھی یاد ہے ،

گاؤں کا گندہ سا وہ تالاب ،

ہم ننگے نہاتے تھے جہاں ؟

وہ ہنس پڑا۔

دیر تک اِک دوسرے کو تاکتے ،

خاموش ہم بیٹھے رہے۔

ان کہی باتوں کو بھی سنتے رہے۔

آخرش مَیں نے کہا :

آؤ !

تم کو شہر کے کچھ خاص لوگوں سے ملاؤں۔

اس کی بوسیدہ قمیص ،

اور چیتھڑا پتلون ،

ہکلانے لگے :

یار ! کل سے پاؤں میں تکلیف ہے !

کیلنڈروں کی نفسیات

اس بنگلے پر رقصاں سرخ دھوئیں کے لچھے
اس کونے میں ہنستے ہیں دو موٹے بچّے
یہ اک ٹیڈی لڑکی ہے۔
اس میں مشعل بھڑکی ہے
بلّی اِک ٹافی کا پیکیٹ کھول رہی ہے
جانی سے ہیلن جانے کیا بول رہی ہے
یہ ٹیگور ہیں وہ گاندھی ہیں
اس میں کچھ کلیاں باندھی ہیں
ننگی عورت کو وہسکی میں گھول کے پیتا ہے خیّام
اس کیلی پر جھول رہے ہیں اُوپر والے کے سو نام
نیا زاویہ تاج محل کا
جنگل پر سایہ بادل کا
جب جب اپنے ذوقِ ناہموار کا تجزیہ کرتا ہوں
سچ مانو میں خود ہی اپنے کمرے میں آتے ڈرتا ہوں

باانخی ــــ!

کارخانے سے نکل کر پارک میں آیا تو کیا
لاؤڈ اسپیکر پہ بھاشن ــــ
(انتخابی سلسلہ)
یہ عطائی ڈاکٹر ہے،

وہ مداری،
آپ دو پشتوں کے بھوکے۔
بولیے! پالش کروں سرکار!
مالش ہی کرالو۔
کوٹ میں بیلے کی یہ کلیاں سجالو۔
(پانچ پیسے فی کلی!)
گھڑگھڑاہٹ، سنسناہٹ، چیخ.......
شوروغل کا حملہ۔
آج کا اتوار بھی ضایع گیا واحسرتا!
ہرطرف آواز دیتا ہے مجھے کوہ ندا!!

جنس سے ہٹ کر

رات ......

جب وہ میرے شانے پر،
مہکتی زلف بکھرائے،
ادا کے ساتھ لیٹی تھی،
تو میں سمجھا تھا،
وہ میری ہے،
بس میری ہے،
سحر نے ردِّ سحر آکر کیا تو یہ کھُلا،
وہ منقسم ہے سینکڑوں خانوں میں،
اس کی ماں،
بہن اس کی،
بہو اس کی ــــ وغیرہ

....

خدا جانے وہ میرے باب میں کیا سوچتی ہوگی!

ایک اور مرحلہ

شام اپنے پر سمیٹے ،
مضمحل انداز سے بوجھل قدم رکھتی ہوئی ،
جنگل کی جانب جا رہی تھی ،

میرا سایہ ،
اس کے پیچھے ہولیا ،

آنے والی رات ،

تنہا خشک آنکھوں سے ،
بھلا کیسے کٹے گی ؟ !

پریشانی کی ادائیگی

تھرڈ کے ڈبے میں،

بیٹھا ہے جو دروازے کے پاس
پچھلے اسٹیشن پہ تھا بے حد اداس۔
تین گھنٹوں سے مسلسل،
بیٹھنے کے واسطے اس کو جگہ ملتی نہ تھی۔
اس نے پہلے ریل کے قانون بتلائے .....
نتیجے میں صفر۔
بعد ازاں ڈبے کو جلسہ جان کر،
اخلاق پر تقریر کی
بے کار ہی۔
آخرش وہ اپنی بیماری کا حیلہ لے کے،
ہر اک مرد و زن سے گڑگڑانے پر اُتر آیا.....
بہر صورت وہ اب بیٹھا ہوا ہے۔
ہر مسافر کو،

جو دروازے کی جانب آئے،
فوراً کاٹنے کو دوڑتا ہے۔
اب یہ ڈبہ بھر چکا ہے!

مرے اشعار کے معنیٰ

اپنے جھرمٹ سے نکل کے ،
رات کے سینے میں اک لمبی خراش ،
ڈال کر ،
ایک ننھا سا ستارہ بجھ گیا۔
اب سویرا ہو نہ ہو ،
اس کی بلا سے ۔

وحشت کی زبانی

زندگی ___؟ تمام قیدِ جسم ہے ___ ہٹائیے
آگہی ___؟ کتاب کے فریب میں نہ آئیے
روشنی ___؟ رہینِ تیرگی ہے ___ آزمائیے
اداسیاں، تکان،
بے حسی، جمود،
خوف و غم۔
یہ ارتقار کی الجھنیں،
یہ فلسفے کا حبسِ دم۔
کسی طرح تو روح کو کھلی ہَوا نصیب ہو،
ہٹائیے یہ زندگی۔
غبار سے اٹا ہوا ہے، جھاڑیے دماغ کو،
فریب ہے یہ آگہی۔
سکون تیرگی کی گود میں چھپا ہے دوستو!
فضول ہے یہ روشنی
روشنی رہینِ تیرگی ہے۔ آزمائیے
آگہی ___! کتاب کے فریب میں نہ آئیے
زندگی تمام قیدِ جسم ہے ___ ہٹائیے

پانی کی زبان

کون سی بستی ہے یہ ،
جس میں میرا ہم زباں کوئی نہیں۔
سینکڑوں الفاظ کی گردن اُڑا دی ،
اور جذبہ ہے کہ پھر بھی اَن کہا ہے۔
بے بسی کی آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں ،
تو یا حیرت !
سبھی بڑھ بڑھ کے سینے سے لگاتے ہیں مجھے !

حروف کے ایٹم

داستانیں لکھتے لکھتے ،

اَن گنت ہاتھوں نے دم توڑا ،
مگر یہ داستانیں ،

آج تک انجام کو پہنچی نہیں ہیں۔
کیوں نہ ہم پیچھے کو پلٹیں ،

چاک کر دیں ان کتابوں کے ورق ،

جملوں کو نوچیں ،
لفظ کے ٹکڑے کریں ،

جب اس عمل سے حرف تک ہو دسترس ،

تو اس کا جوہر بھی نکالیں ،

پھر اسے ایٹم سمجھ کر توڑ ڈالیں۔
غالباً ایسا دھماکہ ہو ،

کہ ساری داستانیں ،

خاتمے کو جا لگیں ــــــ !

اندھیرے سے
اجالے کی طرف

اندھیرا ہوا ،

فلم چلنے لگی ،

زندگی میں نئی جان سی پڑ گئی

رنگ ہنسنے لگے۔

گنگنانے لگیں خوش بوئیں ،

رقص کرنے لگیں سامنے آکے ،

بے نام سی خواہشیں ،

جذبے چونچال بچوں کی مانند ،

کلکار کرنے ، ہمکنے لگے۔

اصل اور نقل کا فرق ہی مٹ گیا۔

پھر اُجالا ہوا ،

کچھ مجسم سی پرچھائیاں ،

نقلی چہرے لگائے ہوئے ،

بھیڑ میں کھو گئیں۔

پرتوں کا زنداں

ہڈیوں کا پنجر،
اس پر گوشت کی تہہ
کھال کی چادر منڈھی،
سوت کے تاروں میں جکڑا،
چار دیواروں میں باندھا،
حس کے بندھن،
بیڑیاں جذبات کی،
پیار کی زنجیر،
رسّی فرض کی،
آگہی کا طوق،
رشتوں کی لگامیں،
اور پھر مذہب کی موٹی ہتھکڑی۔
زندگی کا پیکر دیوہ ....
روح کا دم گھٹ رہا ہے۔

ابلاغ سے پرے

فضا میں ایستادہ روشنی کا ایک مینار،

اسی کے پاس اندھیارے کی دیوار،

ادھر وادی فنا کی،

ہر طرف جس میں دھواں دھار،

جیسے گھیرے ہیں کچھ رنگین بادل،

شوخ، گل نار!

اس طرف خوش بو کی بوچھار،

ذرا ہٹ کر سمندر علم کا،

(جھاگوں کا انبار)

ادھر الجھن،

نہ جانے کیا ہے اس پار؟

ایک انمول پالیسی

میں اسے سمجھا رہا تھا :

زندگی انمول شے ہے ،

قدر اس کی کیجیے ۔

ایک ہی بیمے کی پالیسی ....

اچانک :

ان داتا ! ایک پیسہ !

میں نے جلدی سے ،

اسے اِک پانچ کا سکّہ تھمایا ۔

تاکہ میرا ان داتا ،

وقت پاکر ،

چل نہ دے !

... بھیگی ہوئی تہذیب

پاگل ہوا کے زور سے ،
چھتری الٹ گئی ۔
چہرا ہے پر میں بھیگ گیا ،
اس کا غم نہیں ۔
کپڑے تو ٹیری کاٹ کے ہیں ،
سوکھ جائیں گے ۔
لوگوں کے قہقہوں کی یہ بوچھار ،
الاماں ۔
کس طرح دور ہو گی مری روح کی نمی ۔
چھتری اُلٹ گئی !

بے مقصد — بے کار

بھنبھناتے تار

سن سن بولتے بجلی کے کھمبے کے تلے ،

دو شخص ،

جن میں ایک بہرا ،

دوسرا گونگا ہے ،

جانے کس لیے ،

کب سے کھڑے ہیں ؟

مشرقی چیخیں

عرفی،

مرا چہیتا چالیس دن کا بیٹا
آغوش میں ہے میری
آنکھیں گھما گھما کر،
لائیں چلا چلا کر
جذبے ابھارتا ہے۔
ہنس کر، ہمک ہمک کر کلکار مارتا ہے۔
لیکن ذرا سنو تو!
کارکار کے عقب سے یہ کون چیختا ہے۔

عضو،

مری نہایت خدمت گار بیوی،
میں جس کی ہر ادا پر،

دل سے فریفتہ ہوں ،
عرصے کے بعد،
گھر کے جنجال سے بچا کر تھوڑا سا وقت ،
میرے بستر پہ آگئی ہے ،
سرگوشیوں میں ،
پچھلے بارہ برس میں پل کر چھتنار ہونے والے ،
بے لوث پیار کا اک قصہ سنا رہی ہے۔
لیکن ذرا سنو تو ،
سرگوشیوں کے پیچھے یہ کون چیختا ہے،
یہ کون چیختا ہے۔
یہ کون ......

لچھمن ریکھا

تم کہو گے دن تو میں بھی دن کہوں گا
ہو بلا سے رات آدھی ۔
میں کہوں گا رات ،
تم سورج چمکتا ہو تو اس کو چاند سمجھو گے ۔
تمہاری آنکھ میں آنسو نظر آئیں گے جب ،
میں تعزیت کے ریشمی رومال سے پونچھوں گا ان کو ۔
مسکراؤں میں ،
تو تم اس کو گل افشانی کہو گے
اور دھوکے سے کہیں میں ،
شب کو شب کہہ دوں ،
کہیں تم دن کو دن کہہ کر مجھے سورج دکھا دو ۔
نظر آئے اگر مجھ کو ،
تمہاری آنکھ کے آنسو مگرمچھ کے سے آنسو ،
مرے ہنسنے کے پیچھے جھانکتی محرومیاں تم کو نظر آ جائیں ،
تو سمجھو کہ ہم ،
اک دوسرے کے جسم میں پوشیدہ شیطانوں سے
واقف ہو گئے ہیں ۔

راوٗنوں میں صلح جوئی کے لیے ،
بے حد ضروری چیز ہے ،
لچھمن کی ریکھا ۔

جنگ سے جنگ

میدانِ کارزار سے ہزاروں میل دور،
اپنے چھوٹے سے مکان کے،
تنگ کمرے میں
سوتے سوتے میں چونک پڑا ہوں۔
دروازے بند ہیں،
کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے ہیں،
شیشے اندھے کر دیئے گئے ہیں،
روشنیوں نے جگمگانا ملتوی کر دیا ہے۔
اس کے باوجود،
جنگ نے میری بو پالی ہے،
اور فلیٹ نمبر سات کی انگلیاں،
میری گال پر ہیں۔
ہر چوتھا لقمہ،
میرے بچوں کے منھ سے چھن جاتا ہے
لفافہ ہو یا شکر،
گیہوں ہو یا مٹی کا تیل،
بارود سب سے جزیہ وصول کر رہی ہے
میرا بھائی محاذ پر،
دشمن سے لوہا لے رہا ہے،
مجھے اپنے گھر میں،
جنگ سے جنگ کرنی ہوگی۔

موت کا دوسرا نام

اس کو البم دکھلاتے ہوئے،
میں نے بتلایا
یہ دیکھئے، یہ مرا دوست ہے،
آج کل غالبؔ کینیا میں،
ربر کی کسی فرم میں اونچے عہدے پہ ہے
اس نے چہرے کو لمبا بنا کر کہا،
میں اسے جانتا ہوں،
کئی بار دو چار پگ اس کے ہمراہ بھی پی چکا ہوں۔
یہ چھے سال پہلے مجھے کینیا میں ملا تھا،
مگر اس ملاقات کے دوسرے ہی برس،
ریل کے حادثے میں یہ مارا گیا تھا!
فضا دفعتاً درد سے بھر گئی۔

سمجھ میں نہ آتا تھا، میں اس کی ڈھارس بندھاؤں،
کہ خود چند تسکین کے لفظ چاہوں
تو ایسا بھی ہوتا ہے....
یہ شخص جو میرے البم کے اس کالے پنّے پہ بیٹھا ہوا مسکراتا ہے،
آج تک میرے نزدیک زندہ تھا یہ،
اور میرے تئیں دو گھڑی پیشتر ہی مرا ہے۔
تو کیا موت کا دوسرا نام ہے آگہی!؟

اندھیرے کا انتقام

دن دہاڑے،
چور کیا، ڈاکو کی مانند،
چھت کی کھپریلوں کو سرکا کر اگر،
سورج مرے کمرے میں در آئے،
مری آنکھوں پہ آئینہ سا چمکائے،
تو کیا پھر بھی مجھے یہ حق نہیں ہے؟
دوپہر میں بلب زیرو کا جلا کر،
اس کے چہرے پر،
سیاہی پوت دوں!

خودی کی دہری چھلانگ

میں بہت اونچی پہاڑی پر کھڑا تھا ،
اس لیے کچھ اور بھی اونچی ،
کہ اپنے اصل قد سے دوگنی دکھلائی دیتی تھی وہ مجھ کو۔
میرے نیچے ،
جھیل کا شفاف پانی ،
اس طرح ٹھہرا ہوا تھا ،
جیسے کوئی آئینہ پگھلا ہوا ہو۔
سرخ بیدنگ سوٹ میں ملبوس ،
وہ تہہ میں کھڑا تھا سر کے بل ،
(آسماں کی سمت دونوں پیر تانے)
مجھ کو اس ہیئت کذائی پر ہنسی آئی ،
تو وہ بھی ہنس دیا تضحیک کے انداز میں۔
اس کی اس جرأت پہ جھلا کر ،
لگا دی میں نے نیچے کو چھلانگ ،
اور پھر کیا دیکھتا ہوں ....
سرخ بیدنگ سوٹ پہنے ،
آسماں کی سمت دونوں پیر تانے ،
سر کے بل نیچے چلا جاتا ہوں میں ،
جب کہ وہ ،
سیدھا اُڑا آتا ہے اوپر کی طرف !

ایک فساد زدہ رات

میں چلتے چلتے ٹھٹک گیا
سنسان گلی کے نُکّڑ پر
اک سایہ سا لہرایا تھا
یہ تیری جان کا دشمن ہے
میری رگ رگ نے دہرایا
خوف اُبھرا ریڑھ کی ہڈی سے
سردی میں پسینہ آنے لگا
دس بجنے میں تھے پانچ منٹ
وقت آ ہی لگا تھا کرفیو کا
اپنا بٹوہ، پن اور گھڑی
دے کر بچ لوں، میں نے سوچا
ان چیزوں کو ہاتھوں میں لیے
ڈرتے ڈرتے اس تک پہنچا
پھر آسماں جیسے ٹوٹ پڑا
وہ میرے پاؤں پہ لوٹ گیا
اے بھیا! مجھ پر ترس کھاؤ!
مت مارو مجھ کو مت مارو!!

آگہی کا غم

خبر ملی......

کہ مری والدہ سدھار گئیں۔

مجھے یہ غم ہے کہ اے کاش!

یہ خبر مجھ کو،

بجائے تار کے،

خط سے جو کی گئی ہوتی،

تو چند روز،

یتیمی سے میں بچا رہتا!

جبلّت کے ہاتھ

سائیکل سے گر کے ،

دزدیدہ نظر سے ،

اس نے چاروں اور دیکھا ،

ہنسنے والا دور تک کوئی نہیں تھا ۔

گرمیوں کی دوپہر میں

ہانپتی خالی سڑک لیٹی ہوئی تھی ۔

پیر کی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے ،

اس نے اپنا ہیٹ اٹھایا ،

گرد جھاڑی ۔

سائیکل پر بیٹھ کر چلتا بنا ،

ہنستے ہوئے !!!

ہنسی کا ڈر

بے خوابیوں نے رات مجھے گدگدا دیا ،

اُٹھ کر جو دیکھتا ہوں تو بادل کے جال پر

پیہم لگا رہا تھا قلا بازیاں سی چاند ،

بازو کے ، لالٹین سے عاری ، مکان میں ،

آجا رہی تھی رات ابابیل کی طرح ،

سہما ہوا سکوت کھڑا تھا منڈیر پر ،

پیپل کے لاکھ ہاتھ بجاتے تھے تالیاں ،

چلتی تھی ایڑیل پہ ہَوا پاؤں سادھ کر

جی چاہا ۔ پیٹ تھام کے ، جی کھول کر ہنسوں ۔

پھر تھم گیا کہ میرے پڑوسی نہ جاگ جائیں ،

اور قہقہہ لگائیں !

کھینچے ہے مجھے کفر

خشمگیں چہرہ ،
نظر چبھتی ہوئی ،
ماتھے پہ بل ۔
روز ہی صاحب کا یہ دستور ہے ۔
آج تو میں خیر سے کل تین گھنٹے لیٹ ہوں ۔
کیا قیامت ہے کہ ساڑھے چھے بجے چھٹی ملے ،
پھر سویرے آٹھ بج کر تیس پر حاضر رہو
(زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے)
آج تو میں سوچ کر نکلا ہوں ،
اس طرح دبنے سے اپنا کام چلنے کا نہیں ۔
لیجیے گھنٹی بجی ، طلبی ہوئی ، وہ چل پڑے ۔
سوچتا ہوں میں بھی ان سے کم نہیں ۔
پھر خیال آتا ہے ،
بیوی اور بچے ساتھ ہیں !

آدم کی آخری خواہش

کاش !

پھر وہ وقت آئے ،

جب خدا سارے فرشتوں کو بلا کر

حکم دے :

انسان کو سجدہ کرو ۔

ان فرشتوں کا معلّم ،

پھر خودی کے زعم میں ،

اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دے ۔

طوقِ لعنت اس کی گردن میں پڑے ۔

اور میں آہستگی سے ،

خود ہی اپنے سامنے ،

اِک بار اپنا سر جھکا دوں !

رنگین زاویے کا بیان

چیختے رنگوں کی اِک پُرشور وادی میں ،
حضور !
رقص کے دوران ،
وہ مجھ سے ملا تھا ۔
اس نے میری مانگ میں ،
تارے بھرے تھے ،
منھ پہ مل دی تھی شفق ۔
لوگ اندھے ہیں ،
جو کہتے ہیں کہ اس نے
مجھ سے منھ کالا کیا تھا !

کارِطفلاں

میں گڈو کی سال گرہ پر ،
اِک چھوٹا سا ٹین کا بھالو ،
دو سو پینتالیس روپے میں لے آیا تھا
ایک ہاتھ میں ہیٹ تھا جس کے ،

اور دوسرے ہاتھ میں جام ۔
کوک بھرو تو ٹین کا بھالو ،

ہیٹ ہلا کر ،

کولہے اور آنکھیں مٹکا کر ،

لہرا لہرا کر پیتا تھا ۔
اب گڈو نے ،
جام توڑ کر رسّی باندھ رکھی ہے بھالو کی گردن میں ،
کہتا ہے :
چل پیسے مانگ !

سمندر ہے کف در دہن

ہمارا وطن ایک گہرا سمندر،
سمندر جو ہے صلح جو، امن پرور،
کہ ساحل کو خطرہ نہیں جس کی امواج خوش گام سے،
سمندر کی گہرائیوں کا پتہ دشمنوں کو نہ تھا۔
وہ یہ سمجھے کہ پانی تو پانی ہے ـــــ سیال اور نرم رو
جس میں جب چاہو بے خوف بس گھول دو۔
سمندر کی گہرائیوں کا پتہ دشمنوں کو نہ تھا،
اور ناواقفیت کو اپنی شجاعت سمجھ کر،
سمندر پہ دشمن نے کچھ سنگ ریزے اچھالے،
جواباً اٹھیں چند ہلکی سی لہریں،
سطح پر آبگینوں نے انگڑائی لی اور پھر سو گئے۔
سنگ ریزے سمندر میں گم ہو گئے۔
اور یہ دیکھ کر نا سمجھ دشمنوں کے بہت حوصلے بڑھ گئے

وہ یہ سمجھے کہ پانی تو پانی ہے سیال اور نرم رو،
جس میں جب چاہو بے خوفِ بس گھول دو،

اور پھر.....
ایک دن دشمنوں نے سمندر میں پتھر گرا لئے،
سمندر جو ہے صلح جو، امن پرور،
کہ ساحل کو خطرہ نہیں جس کی امواج خوش گام سے،
سمندر ہی آغوشِ طوفاں بھی ہے دشمنوں کو خبر ہی نہ تھی،
چاروں جانب غضب ناک لہریں اٹھیں،
ہر طرف زیرِ افلاک لہریں بڑھیں،
سنگ ریزوں پہ سفاک لہریں بڑھیں،
آبگینوں سے طوفان ابھرنے لگے،
فرطِ غیض و غضب میں ہر اِک موج ہے جھاگ اڑاتی ہوئی،
جوش میں سطحِ آب آگ اڑاتی ہوئی۔

سمندر کی گہرائیوں کا پتہ دشمنوں کو نہ تھا۔
دیکھ لینا کہ تنکوں کی مانند بہہ جائیں گے سارے دشمن،
آج گہرا سمندر ہے کف در دہن !

معاشرے کا سفید ہاتھی

چھوٹی سی چونے کی پپڑی گر جانے سے،
کمرے کی دیوار پہ،
اک ننھا سا خاکہ آ بیٹھا تھا۔
بد حلیہ اور بھونڈا خاکہ۔
سوچا یہ تھا،
تھوڑا چونا بھر کر،
اس مینڈک سے کمرہ خالی کر لوں۔
مینڈک تو غایب ہے،
لیکن اِک موٹا بد ہئیت ہاتھی،
بے باکانہ اس کمرے میں در آیا ہے۔
یعنی ....
اب یہ پورا کمرہ،
دوبارہ پُتوانا ہوگا۔

سامنے کا واقعہ

......آپ سچ مانیں کہ جھوٹ ۔

ہر طرف دزدیدہ نظریں ڈال کر ،

اس نے چپکے سے سپاہی کو بلایا ،

سَو کا اِک پتّہ دکھایا

مونچھ پھڑکا کر سپاہی نے کہا ـــــ

کیا چاہتے ہو ؟

گڑگڑا کر عرض کی ـــــ

جی ! خودکشی کرنے کی چھوٹ !

آپ سچ مانیں کہ جھوٹ ،

سامنے کا واقعہ ہے ۔

پرانی تنقید کا باب

زنگ لگے ،

دیمک خوردہ ،

یہ بھاری پھاٹک ،

جو سالوں سے بند پڑے تھے ،

بن کر ویرانی کے پہریدار ،

کھڑے تھے ۔

ان کو ،

کھلنے میں تھوڑی تکلیف تو ہوگی ،

چیں چوں ،

چوں مر ،

کھٹ پٹ جیسی ،

بھونڈی آوازیں نکلیں گی !

ٹوٹی ہوئی کڑیاں

وہ، جو اس غلّے کے کیو میں آٹھویں نمبر پہ تھا
دل کی بیماری نے اس پر دفعتاً حملہ کیا
تھر تھرایا ، لڑکھڑایا ، ڈگمگایا، گر گیا
ساتویں نمبر پہ تھا جو، بن مڑے آگے بڑھا
نو پہ اک بڑھیا تھی جس نے منہ پہ آنچل رکھ لیا
دسویں نمبر نے ذرا سا جھک کے دیکھا. ہنس دیا
بارہویں کا پوچھنا تھا " بھائی صاحب !کیا ہوا"؟
گیارھواں یوں ہی بھرا بیٹھا تھا ، فوراً لڑ پڑا
ہوگا کچھ، میری بلا سے ___ اب اگر دھکا لگا
کھول دوں گا سر ترا !

نئے نظریے کی تخلیق

کانچ کی رنگین ٹوٹی چوڑیوں کو،
آئینے کے تین ٹکڑوں میں،
کسی بھی ڈھنگ سے رکھیے
نیا خاکہ بنے گا،
جس میں اک ترتیب ہو گی۔
لاکھ جھٹکے دیجیے،
ہر بار یہ ترتیب،
اک ترتیب نو میں ہی ڈھلے گی۔
جب بھی کچھ ٹوٹے ہوئے لوگوں میں،
اپنے تجرباتِ خام کے قصّے چھڑیں گے،
اک نظریہ جنم لے گا۔

اصلیت کا زہر

سانپ کے بارے میں ،
دانتوں کو ہٹا کر سوچیے تو ،
کیچوا رہ جائے گا۔
لیکن یہ دانت ......
کاش
یہ ہاتھی کے ہوتے !!

اپنی تلاش کی مہم

رات یوں ہی تھک چکی تھی۔
صبح نے دامن کو اپنے
آخری جھٹکا دیا،
اور بھاگ نکلی۔
خوف سے تاروں نے آنکھیں بند کر لیں،
چاند نیچے گر پڑا۔
اس طرف ......
سورج کے کوڑے پیٹھ پر کھاتے ہوئے،
صبح بھاگی جا رہی تھی تیز تیز۔
اس نے تھم کر بھی نہ دیکھا،
دوپہر کا سنگ میل،

کب قریب آیا تھا ،

اور کس وقت پیچھے رہ گیا تھا۔

اور سورج نے کہاں کس راستے پر ساتھ چھوڑا

وہ تو اپنی دھن میں آگے ،

اور آگے ،

تیز تیز ،

بھاگتی ہی جا رہی تھی۔

آخرش وہ تھک گئی۔

اور اس نے تنگ آکر ،

شام کی آغوش میں سر رکھ دیا !

چھڑی اور پتھر

یاد کیا ہوگا تمہیں،
چھوٹی سی تھیں تم۔
ایک لڑکے نے تمہیں،
اپنی چھڑی سے پیٹنا چاہا تھا جب،
(تتلی پہ قضیہ تھا کوئی)
میں نے اپنے ہاتھ پر جھیلی تھیں چوٹیں۔
پھر بڑا ہوکر وہی لڑکا،
تمہیں مجھ سے چُھڑا کر لے گیا تھا۔
جانے کیوں یاد آگیا وہ واقعہ؟
آج پھر اس ہاتھ میں چوٹ آگئی ہے،
ایک پتھر سے کچل کر!

اکیسویں صدی میں

چاند سے ایتھر گرام آیا
کہ نمبر آٹھ سو چالیس ایف ٹی
(یعنی میرا ساڑھے پینتالیسواں بچہ)
خلا میں کھو گیا ہے۔
قرص اشک آور نگل کر،
میں نے کچھ آنسو بہائے،
اور اپنی، نصف کی بھی نصف بہتر کو
خلائی فون پر زہرہ سے یہ پیغام پہنچایا،
تو وہ ہنسنے لگی۔
میرے استفسار پر،
اس خندۂ بے وقت کا اس نے بتایا یہ سبب

آٹھ سو چالیس ایف ٹی
یوں بھی آدھا ہی تو تھا،
وہ جو پورے پورے پینتالیس،
سورج تک پہنچنے کی سعی میں،
ہاتھ سے جاتے رہے،
ان کی بھی سوچو۔
پھر کہا:
میں آرہی ہوں،
چاٹ لو،
معجون محشر خیز

نیچے کی آواز

وقت کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہوں۔
میرے چاروں اور گدلی لجلجی یادوں کی تہہ ہے
سر پہ بیتی عمر کے ٹوٹے ہوئے لمحوں کا بوجھ۔
اس سفر کی ابتدا کیسے ہوئی تھی،
یہ خبر مجھ کو نہیں۔
یاد بس آتا ہے اتنا
والد مرحوم کچھ اوپر ہی مجھ سے رہ گئے تھے۔
انتہا کیا ہے سفر کی،
کون جانے؟
سانس کا ہر تازیانہ،
مجھ کو نیچے، اور نیچے کی طرف ہی کھینچتا ہے،
جانے میں تہہ تک بھی پہنچوں گا،
کہ والد کی طرح،
اپنے بچوں کو بھی دھنسنے کے لیے کہہ جاؤں گا۔
وقت کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہوں۔

دائرے سے مربعہ تک

زمیں گول تھی،
(یعنی اس کی کوئی حد مقرر نہ تھی)
مگر تم نے اس پر،
سمندر کے پردے لگا کر،
کئی برِ اعظم بنائے۔
پہاڑوں کو دیوار،
ندیوں کو خندق بنا کر،
اسے سینکڑوں تنگ ملکوں میں بانٹا۔
ہر اِک ملک میں رنگ اور نسل،
تہذیب و مذہب،
زبان و ثقافت کی چھریاں چلا کر،
اسے صوبوں میں،
شہروں میں قصبوں میں،
گاؤں میں ٹکڑے ٹکڑے کیا۔
پھر وہاں بھی، علاقے محلے کی قاشیں،
محلوں میں گھر،
پھر گھروں میں بھی کمرے،
کئی مستطیلیں،
ہزاروں مربعے!

بتاؤ!
کہ ان چار دیواروں میں بیٹھ کر،
تم کو اپنی گھٹن،
اور اس حبس و تنہائی کی شکل میں،
جو سزا مل رہی ہے،
وہ کیوں کر غلط ہے؟
زمیں گول رکھنے میں ہی مصلحت تھی!

نئے سال کی آمد پر نثری نظم

دھواں دھواں دماغ ،

آنکھوں میں ریت ،

ہونٹوں پر دراڑیں ،

زبان پر کانٹے ،

فاصلے کی طرح سکڑتی اور پھیلتی ہوئی ،

رگوں کی طنابیں۔

خون اڑسٹھ (۶۸) سال کے اس طویل سفر کے بعد،

اپنی گم راہی سے آگاہ ہو گیا ہے۔

بدلتے لمحوں کی آواز

کون ہے جو دوپہر میں ،
ہر قدم پر ساتھ رہ کر ،
مجھ سے کہتا ہے ،
کہ تو آقا ہے میرا ،

کون ہے ،
جو رات کی تاریکیوں میں ،
میرے ہی اندر سما کر ،
مجھ سے کہتا ہے ،
کہ تو کچھ بھی نہیں ،
اس وقت میں آقا ہوں تیرا

اندھے آئینے کا قتل

دفعتاً ایسا لگا،
میرے سارے جسم میں آنکھیں ہی آنکھیں ہیں،
مجسم آنکھ ہوں میں۔
میں نے دیکھا،
اس نے تھوڑی دیر کھڑکی پر ٹھہر کر،
اپنی آنکھیں مچمچائیں،
اور پھر جالی کو بوسہ دے کے وہ،
آگے بڑھی
راستے میں کانچ کی دیوار تھی،
(اور سچ یہ ہے کہ آخر وقت تک قائم رہی وہ)
پھر بھی جانے کس طرح،
پلکیں جھپکتے ہی وہ اندر آگئی۔
اندر آکر،
اس نے سینے میں مرے خنجر اتارا۔
دیکھ لو،
اب تک اُبلتا ہے مرے سینے سے،
چاندی کا لہو!

سندباد کی واپسی

قوم رہبر کے ایوانوں سے سر ٹکرا کر،
لوہے کے تپتے بازاروں سے گھبرا کر،
اپنی ذات کی بھول بھلیوں سے اکتا کر،
عہدِ نو کے فلسفیوں سے آنکھ بچا کر،
فن کاروں کی اُلجھی باتوں سے چکرا کر،
سہلانے والے ہاتھوں سے چوٹیں کھا کر،
اندر سے باہر کی جانب،
سندباد جب واپس لوٹا،
اس نے چاروں جانب پھیلی دنیا کو،
جب غور سے دیکھا۔
پیدل چلنے والے پہلے سے زاید تھے !
ننگے پھرنے والے پہلے سے زاید تھے !!
بھوکوں مرنے والے پہلے سے زاید تھے !!!

ڈوبنے جاؤں تو دریا.....

کرارے نوٹ
چھن چھن بولتے سکے،
شئیر، ہُنڈی،
چمکتی میز، الماری،
نگر کے سیٹھ، افسر اور پھران کے حواری،
کلرکوں کی زباں پر موٹے موٹے ہندسے جاری،
قلم بھاری۔
فضا میں بینک کی ہر سمت اک سنجیدگی طاری۔
نہ جانے کیسے چوکیدار کی آنکھیں بچا کر،
نیم خبطی اک بھکاری،
کب، بڑے صاحب کے کمرے میں در آیا،
لگا تھا پیٹھ سے جو پیٹ، دکھلایا۔
کہا:
سرکار مل جائے اگر اک نوٹ دس کا،
میں چنے لے کر چبا لوں،
پیٹ کا دوزخ بجھا لوں۔
جواباً گونج اٹھی قہقہوں سے بینک کی بلڈنگ وہ ساری،
کھل گئی جیسے کمانی....
جی!
سمندر میں نہ تھا پینے کا پانی !!!

فیڈنگ پرابلم

شہر میں کرفیو لگا ہے۔
میری ہمسایہ کے گھر طوفاں بپا ہے۔
دودھ اس کی چھاتیوں سے بہہ رہا ہے
بھوک سے بے حال اس کا بچہ کپڑے نوچتا ہے
دودھ کا ٹِن اس طرف خالی پڑا ہے۔
شہر میں کرفیو لگا ہے۔

وصل کی سوغات

شکر ہے منھ میں کسی کے،

تو کوئی خالی ہات۔

کسی کی لاش سے الجھی ہیں،

دیر سے چھ سات۔

ہر ایک کرتی ہے،

اِک دوسرے کو سونگھ کے بات۔

تمام جسم پہ،

پھیلی ہے چیونٹیوں کی برات۔

تمہارے ہجر کی رات!

تیشہ زن منقار کا پہلا وار

کہاں تو یہ کہ حفاظت کی انتہا کر دی،
ذرا سی ٹھیس پہ دل اس خیال سے لرزا،
کہ اس فصیل میں کمزور و نیم جاں یا جوج،
ہے انتظار میں اک مدتِ معین کے،
(وہ جس کی شرط ہے تکمیلِ بال و پر کے لیے)
پیام مرگ تھی اس کو،
شکست زنداں کی۔

کہاں یہ حال کہ دل جھوم جھوم اٹھا ہے،
چلا رہا ہے وہ اندر سے تیشۂ منقار،
شکست کھانے پہ آمادہ ہے سفید فصیل!

صورِ اسرافیل

اب تو بستر کو جلدی سے تہہ کر چکو
لقمہ ہاتھوں میں ہے تو اسے پھینک دو
اپنے بچوں کی جانب سے منہ پھیر لو
اس گھڑی بیویوں کی نہ پروا کرو
راہ میں دوستوں کی نظر سے بچو
اس سے پہلے کہ تعمیل میں دیر ہو
سائرن بج رہا ہے۔ چلو دوستو!

ڈھلتے جاڑے کی دوپہر

آنگن میں بیٹھو تو گرمی ،

کمرے میں لیٹو تو سردی ،

کیا الٹا سیدھا موسم ہے ،

جیسے میرا ہیڈ کلرک !

ٹوٹے ہوئے لوگوں کی خاطر

ہزار چاہا کہ سچ بول دوں، سکون ملے۔
یہی کہ میرا کوئی بھی نہیں یہاں،
میں بھی کسی کا ہوں نہ کبھی ہو سکوں گا دنیا میں،
ہر ایک فرد اکیلا ہے،
میں بھی تنہا ہوں۔
مگر ہمیشہ یہ احساس آڑے آیا ہے،
کہ لوگ خود ہی تو ٹوٹے ہوئے ہیں،
(میں خود بھی)
اب ان کے ہاتھ سے کیا رشتۂ امید چھڑاؤں،
یہ زندگی تو خود ایک ریگ زار ہے،
اس میں مزید خاک اڑانے کا نام "سچ" تو نہیں۔
اسی گناہ کی،
ملتی رہی مجھے پاداش۔
صلیبِ دل پہ لٹکتی رہی شعور کی لاش!

میری نظموں کا مصرف

میں نہیں کہتا،
کہ میری کھردری نظموں کو پڑھ کر،
سنگ میل راہ نو تسلیم کیجیے۔
میری نظمیں تو،
روایت کی بہت پامال و فرسودہ سڑک کے دونوں جانب،
کنکروں اور پتھروں کے ڈھیر کی مانند ہیں،
جن سے،
آئندہ نئی راہیں بنائی جائیں گی۔

نوکی لکڑی ......

حرف مل کر لفظ بنتے ہیں ،
کئی الفاظ مل کر ایک جملہ ،
سیکڑوں جملوں سے بنتی ہے کہانی ۔
یعنی ......
کہنی ہو اگر اک حرف ہی کی داستاں ،
ان گنت الفاظ ہوں گے آں جہانی !

مسکراہٹ کے بیج

کس جگہ میں نے اس کو دیکھا تھا،
کون سا ماہ،
کون سا دن تھا،
یاد اس کے سوا نہیں کچھ بھی،
کار زَن سے نکل گئی تھی مگر،
کار سے جھانکتا ہوا چہرہ،
دیکھ کر مجھ کو مسکرایا تھا،
جانے کیا بات ہے،
کہ میں جب بھی،
جس جگہ بھی اداس ہوتا ہوں،
کار سے جھانکتا ہوا چہرہ،
یاد آتا ہے،
مسکراتا ہے،
اور میں مسکرانے لگتا ہوں۔

بصیرت مل گئی جب سے ....

شفق سی کھل گئی کیوں مطلعِ احساس پر،
کیوں یہ دھنک سی تن گئی شہ رگ میں،
ہر قطرہ لہو کا کیوں تھرکتا ہے،
شہادت کے لیے بے چین کیوں ہوں میں؟
سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔
بجز اس کے،
کہ اپنی ہی نگاہوں میں،
مرا اِک راز افشا ہوگیا ہے۔
یہ، کہ میں بزدل ہوں!

ہابیل کی منطق

کوٹھے سے ،
حوّا کی بیٹی جھانک رہی تھی ۔
اس نے اپنا بٹوہ دیکھا ،
ٹھنڈے دل سے غور کیا ۔
پہلے جانے میں پیسے زائد لگتے ہیں ،
اور سمے بھی کم ملتا ہے ۔
لہجے میں ایثار سمو کر ،
وہ اپنے ساتھی سے بولا ،
پہلا حق تو تیرا ہے ،
بھائی قابیل !

دوسری جلاوطنی

جب گیہوں کا دانا جنس کا سمبل تھا،
اس کو چکھنے کی خاطر،
میں جنّت کو ٹھکرا آیا تھا۔

اب گیہوں کا دانہ،
بھوک کا سمبل ہے۔
جس کو پانے کی خاطر،
میں اپنی جنّت سے باہر ہوں!

بات کی بات

ہُوا جانے کیا کان میں کہہ گئی ،
کہ برگد کے پتّوں نے تالی بجائی ،
شگوفے نے سُن کر تبسّم کیا ،
تھرکنے لگی لہر تالاب میں ،
بھڑک کر چراغِ سحر بجھ گیا۔
ہُوا جانے کیا کان میں کہہ گئی........

چھوت کے بیمار

دوسری یا تیسری انگلش کی ریڈر میں ،
پڑھی تھی یہ کہانی ،
ایک ننھا پودا نہ ،
جو آسماں کی سمت ٹانگیں کر کے سوتا تھا ،
بہ زعم خود سمجھتا تھا ،
کہ وہ روکے ہوئے ہے آسماں کو ،
اپنے پیروں پر .....
اور اب اک تم ملے ہو ،
تم ....
جو کہتے ہو غم دوراں کو سینے میں بسا رکھا ہے تم نے ۔
سوچ کر دیکھو تو خود محسوس کر لو گے ،
حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے ،
غم جو بیماری ہے اُڑ کر پھیلنے والی ،
اسے تم بانٹتے پھرتے ہو لوگوں میں !

دن چڑھ آیا

چل ہم زاد !

میرے بستر میں تو آجا

کالی نفرت ،

سرخ عقیدت ،

بھوری آنکھوں والی حیرت ،

بھولی بھالی زرد شرافت ،

نیلا نیلا اندھا پیار ،

رنگ برنگے غم کے تار ،

خوشیوں کے چمکیلے ہار ،

دھانی ،

سبز ،

سپید ،

سنہرے ،

اپنے سارے نازک جذبے ،

پھر دن بھر کو ،

تجھ کو سونپے ۔

مصلحتوں کے شہر میں ان کے

لاکھوں ہیں جلاد

دن چڑھ آیا ،

چل ہم زاد !

دیکھ مرے من

شیشے کی جادو نگری میں جس پُتلی سے پیار کرے گا،
تیری جان کی گاہک ہوگی۔
تو جن پھولوں کو چومے گا،
بچھو بن کر وہ ڈس لیں گے۔
تیری پرچھائیں تک تجھ پر موقع پا کر وار کرے گی۔
پانی جب پینا چاہے گا،
تب امرت کی دھار ملے گی،
جب امرت پینا چاہے گا مرنے کو تلوار ملے گی۔
چکنے چہرے دھوکا دیں گے۔
اندر جب طوفان اٹھے گا،
آنکھوں میں آنسو آئے تو رونا دو بھر ہو جائے گا۔
شیشے کی جادو نگری میں،
سر ٹکرا کر کیا پائے گا۔
دیکھ مرے من!

فصیلِ جسم کے زندانیوں سے

نہ جانے کب،
کوئی تازہ ہوا کا سرد جھونکا،
اس طرف آجائے
اور مایوس پلٹے۔
کیا خبر کس وقت،
چنچل روشنی کی کوئی آوارہ کرن،
اس اور آنکلے،
کسی دیوار سے سر پھوڑ کر واپس چلی جائے۔
کسے معلوم کب،
معصوم رنگوں کی کوئی تتلی،
ادھر سے ہو کے گذرے،
اور دروازے سے ٹکرا کر ہی رہ جائے۔
کبھی چونچال سا کلکارتا نغمہ ہی آنا چاہے۔
اور دم سادھ لے مایوس ہو کر،
بہت ممکن ہے خوش بو کا پرندہ ہی کبھی آئے،
سلاخوں سے پروں کو مس کرے،
مجبور ہو جائے۔

تو اے بے دست و پا لوگو!
برا کیا ہے
اگر
روزن کھلے رکھو!

اندر کا ایک مکالمہ

یہ کون آیا ،
کہیں کوئی نہیں ہے یہ تو میں ہوں ،
تیرا اپنا میں ۔

ارے !
تجھ کو تو میں نے قتل کر کے ،
بے حسی کے سرد اور اندھے کنوئیں میں
دفن کر رکھا تھا ،
تو کیسے ؟
بہت معصوم ہے تو ،

کیا ، تجھے یہ بھی نہیں معلوم اے ناداں ،
کہ جب بھی تیرے دل میں ،
کروٹیں لیتی ہے میرے واسطے نفرت ،
تو ایسے وقت میں ،
ہوتا ہے تو ہر سمت سے میرے اثر میں ۔
جسے تو قتل کر کے دفن کر آیا ،
وہ تو تھا ۔
اور یہ میں ہوں ،
تیرا اپنا میں !

تیشۂ استخواں

اس کے بازو شل تھے ،

چہرہ تمک رہا تھا ،

وہ جھنجھلایا بیٹھا تھا۔

بھور سے گھن برسا برسا کر ،

سانجھ ہوئی ،

لیکن پتھر ٹوٹ نہ پایا۔

بھوکا پیاسا کُتّا ،

اس کا دامن اپنے منھ میں لے کر ،

من کی بانی بولا :

مالک ! تھکے ہوئے ہو اب تو گھر کو لوٹ چلو "

جھلّاہٹ میں ،

اس نے ٹانگ پکڑ کر کتّے کو ،

پتھر ہی پر دے پٹکا۔

پتھر چھن سے ٹوٹ گیا !

تم یہاں دبکے ہوئے ہو

میں خلاؤں میں پھرا ،

پاتال میں بھٹکا ،

سمندر چھان مارے ،

وسعت صحرا کو مٹھی میں لپیٹا ،

چاند سورج کھونڈ ڈالے ،

اپنی گردن پر لیا تاروں کا خون

وقت کی لاکھوں طنابیں کاٹ دیں ،

آخرش ،

تھک ہار کر ،

(جب تم نہ مل پائے تو)

آلیٹا ہوں ،

اس اندھی گپھا میں ،

تم یہاں دبکے ہوئے ہو !

سفر کا ایک دن

.... پھر ہم نے آب و گِل کے لبادے اتار کر ،
اعمال کی خلیج ،
بیانوں سے پار کی ،

اس پار کی زمین (جو دلدل نہ تھی ، مگر)
کاغذ کی طرح پھٹ کے قدم تھامنے لگی ۔
ہم بھاپ بن گئے ،
رستے میں آسمان ملے (روئی کے بنے)
جو انگلیوں کی آنچ نہ برداشت کر سکے ،
دیکھا :
کہ اس طویل اندھیری گپھا کے بیچ ،
(لمحوں کی ٹوٹی الجھی ہوئی ڈور کے سرے، گردن میں ڈال کر)
لٹکا ہوا تھا وقت ۔
آگے بڑھے تو آگ کا دریا تھا درمیاں ،
احساسِ بے حسی نے جسے سرد کر دیا ،
کچھ اور آگے چل کے دھند لکے تھے ذات کے ،
ہم ان میں کھو گئے ۔
(مرحوم ہو گئے !!!)

تیرے میرے بندے

ڈھل گیا سورج
تو میں نے چاند سے پوچھا ،
کہیں میرا خدا تُو تو نہیں ؟

چاند بولا :
چند گھنٹوں بعد
میں خود بھی اسی انجام کو پہنچوں گا ،
اس کا غم نہیں ۔

افسوس یہ ہے ،
میں سمجھتا آرہا تھا ،
آج تک تجھ کو خدا !

قصہ طوطا مینا جدید

مینا بولی — دن کتنا لمبا ہے،

طوطے!

اپنی بیتی ہی کہہ ڈالو۔

طوطا بولا — "مٹھو بیٹے!"

مینا بولی — سچ کہتے ہو۔

پھر مینا نے اپنے اور زمانے بھر کے،

دُکھڑے طوطے سے کہہ ڈالے۔

رات ہوئی۔

مینا بولی — رات کٹھن ہے،

جگ بیتی سنواؤ مٹھو!

طوطا بولا — 'مٹھو میاں' !!

مینا بولی — سچ کہتے ہو !!!"

جستجو کا مشورہ

سرخ زرّو !

سرد کالی دھوپ سے بچتے ہوئے ،

زرد رنگوں کی خلا کو پار کر لو۔

آسماں ،

نیلا ہٹوں کے ساتھ ،

اپنی گود پھیلائے ،

کھڑا ہے۔

پچھلے فیصلے کی روشنی میں

سبھی کہیں گے غلط ہے،
اگر کوئی بھوکا،
مرے مکان پر آکر سوال کرتا ہے،
تو یہ غلط ہے اسے نامراد لوٹا دوں،
بنام اہل و عیال!
جناب شیخ بتائیں کہ یہ غلط ہے نا؟

جناب شیخ بتائیں......
وہ نوجوان ہے،
اس کا بھی ایک جسم ہے جو
(سبھی کی طرح)
کچھ اپنے تقاضے رکھتا ہے۔
مگر وہ شومیٔ قسمت سے بال وِدھوا ہے۔
بچا بچا کے نظر پھول پھینکتی ہے وہ!
مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھتی ہے وہ!
جناب شیخ اگر حکم دیں تو پیار کروں؟

پاکیزگی کا سولہواں سال

آنکھیں ہی آنکھیں اُگ آئی ہیں سارے دروازوں پر،
اپنا خون ہی،
گندی گندی باتیں کرتا ہے کانوں میں،
ہر کھونٹی میری جانب انگشت نمائی کرتی ہے،
گھور گھور کر،
مجھ کو ہر شے دیکھ رہی ہے۔
گرم گرم سانسوں کے بھبکے،
تکیے سے نکلا کرتے ہیں،
گیلے ہونٹ ہوا کے،
میرے گالوں پر رینگا کرتے ہیں۔
اِک انجانی خواہش پلّو کھینچ رہی ہے۔
اپنی ہی پرچھائیں مجھ کو بھینچ رہی ہے !!!

دی اِنڈ

گھپ اندھیارے میں ،
نورانی انگلی جانے کیا لکھتی تھی ۔
رنگوں کی خوشبو پھیلی تھی ۔
ڈالی ڈالی ہونٹ کھلے تھے ۔
آسمان گیسو گیسو تھا ۔
پیمانوں میں نیلی آنکھیں تیر رہی تھیں ۔
سانسیں گھنگھرو سی بجتی تھیں ۔
پلکیں جھپکاتے ہی ،
نازک سپنا ٹوٹ گیا ۔
جیسے پکچر چھوٹ گیا !

بزدلی

(مرنے کے جرم میں حضرت شاد عارفی پر طنز)

یہ کوئی طریقہ ہے، طنز یوں نہیں کرتے شاد عارفی صاحب
آپ جیسے دل والے اس طرح نہیں مرتے شاد عارفی صاحب

باغباں کی سازش سے پھول توڑ کر گل چیں خار میں پروئیں گے
نام لے کے طوفاں کا ناخدا سفینوں کو ریت میں ڈبوئیں گے
آپ کی تمنا تھی جیل جا کے مرنے کی، بھول ہو گئی شاید
اس کرائے کے گھر میں انتقال کرنے کی بھول ہو گئی شاید
لوٹتی رہی پیہم ساٹھ سال جو دنیا یوں نہ بخشیے اس کو
ماں کی موت پر اپنا جو مکان بیچا تھا یاد کیجیے اس کو
شاد عارفی صاحب! آپ کو تو دنیا سے انتقام لینا ہے
سوچیے زمانے نے آپ کو دیا کیا ہے آپ سے لیا کیا ہے
فکر و فن کے بدلے میں تلخیاں عطا کی ہیں جس سماج نے قبلہ!
پر خلوص سینے پر برچھیاں چلائی ہیں جس سماج نے قبلہ!

آپ کی خموشی پر وہ سماج ہنستی ہے، دیکھ لیجیے مڑ کر
پھر کوئی نئی پھبتی، طنز کا کوئی نشتر، وار کیجیے مڑ کر
بزدلی نہ ہوگی کیا زندگی کے مجرم کو یوں معاف کر دینا
موت کا تو مطلب ہے ظلم کے لیے راہیں اور صاف کر دینا

خیر ہم سمجھتے ہیں موت سے نہیں ڈرتے شاؔد عارفی صاحب
یہ بھی طنز ہی ہوگا، مر کے بھی نہیں مرتے شاؔد عارفی صاحب

۱۹۶۳ء

نصیحت

(شاد عارفی کی موت پر اپنے بیٹے کے لیے)

گڈو بیٹے ! روتے کیوں ہو ؟
قصہ سننے کی خواہش ہے ؟
اچھا اپنے آنسو پونچھو،
لو ہم اک قصہ کہتے ہیں !
چونسٹھ سال گذرتے ہیں،
افغانوں کی اک بستی میں لڈن خاں نے جنم لیا تھا،
داروغہ کے بیٹے تھے وہ، نانا ان کے مولانا تھے
کھاتا پیتا گھر تھا ان کا۔
لڈن خاں اچھے بچے تھے (بالکل ویسے جیسے تم ہو)
ان کے گھر والے بھی ان سے اتنی ہی الفت کرتے تھے جتنی ہم تم سے کرتے ہیں
جب وہ تھوڑے بڑے ہوئے تو،
نانا ان کو مکتب میں داخل کر آئے،
لڈن خاں نے پڑھنا سیکھا،
لکھنا سیکھا، لڑنا سیکھا (آخر وہ افغانی بھی تھے)
چودہ پندرہ برسوں میں ہی لڈن خاں کو یہ بے فکری راس نہ آئی

نانا اور ابّو دونوں نے لڈن خاں سے کٹی کر لی
(مرنا جینا تم کیا سمجھو)

تب مجبوراً

لڈن خاں نے پڑھنا چھوڑا،

اپنے گھر سے ناطہ جوڑا،

ٹیوشن کرتے، کشتم پشتم اپنے گھر کا خرچ چلاتے،

ان کی اماں کو راجہ سے تھوڑی سی پنشن ملتی تھی، کام کسی صورت چل جاتا

ماں نے ان کی شادی کر دی

لیکن بیوی خوش قسمت تھی جس نے جلدی ہی کٹی کر لی۔

گڈّو بیٹے!

ہونی ہو کر ہی رہتی ہے۔

مکتب میں رہ کر لڈن خاں غزلیں کہنا سیکھ چکے تھے۔

افغانی ہونے کے ناطے لوگوں سے ڈرتے بھی کم تھے،

اپنی غزلوں میں، نظموں میں تیکھی تیکھی باتیں کہتے، لوگوں پر پھبتی کستے تھے۔

(اپنے ہوں یا غیر سبھی پر)

سچ کہنے میں، سچ لکھنے میں باک نہ کرتے (یہ تو ایک نشہ ہوتا ہے)

بس پھر کیا تھا، اپنے غیر سبھی ان کے دشمن بن بیٹھے۔

ٹیوشن چھوٹے، 'وے مینی' کی 'وے مینی' سے منشی گیری،

در در بھٹکے باز نہ آئے،

کڑوی تیکھی، غزلیں، نظمیں، کہہ کہہ کر انبار لگایا،

اتنے سے بھی چل سکتا تھا

لیکن وہ تو راجہ جی پر پھبتی کس کر امی کی پنشن لے ڈوبے۔

(بولو ان کی کیا اٹکی تھی۔ راجہ جو کچھ بھی کرتا تھا، لڈن خاں سے کیا مطلب تھا)

امی بیچاری اس غم میں کڑھ کڑھ کر پردیس سدھاریں ایوں سمجھو بس روٹھ گئیں وہ لڈن خاں سے)

لیکن بیٹا ! مرنے میں پیسے لگتے ہیں۔ لڈن خاں نے گھر بھی بیچا۔

آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اب تو لڈن خاں کھل کھیلے

سچی سچی باتیں کہہ کر، کڑوی تیکھی غزلیں لکھ کر، زہر آلودہ نظمیں پڑھ کر،

ایک سرے سے سب لوگوں کو دشمن در دشمن کر بیٹھے۔

ساری دنیا دشمن ہو تو لڈن خاں بھی بچتے کیسے،

سب نے مل کر گھیرا ڈالا۔

آگے دشمن پیچھے دشمن، دائیں دشمن بائیں دشمن اوپر دشمن نیچے دشمن ....

لڈن خاں میں عقل نہیں تھی اب بھی چکنی چپڑی باتیں کر کے چپکے سے بچ لیتے۔

لڈن خاں نے اپنی غزلیں، اپنی نظمیں، ساری چیزیں چھوڑ چھاڑ کر،

چپکے سے مر جانے ہی کو بہتر جانا۔

گڈو ! میرے پیارے بیٹے !

میرے راج دلارے بیٹے !

دیکھو تم غزلیں مت کہنا !

بیٹے ! تم نظمیں مت لکھنا !

لکھنا ہی پڑ جائے تو پھر سچ مت لکھنا !

دیکھو بیٹا !

سچ مت لکھنا !!

سچ مت لکھنا !!!

اندھیر نگری

اونچی اونچی۔ لوہے کی دیواریں اس کے چاروں اور
ایک سمندر بے چہرہ لوگوں کا جس کا اور نہ چھور
مشعل روشن کرنے سے ہو جاتا ہے اندھیارا گھور
جگمگ جگمگ سورج سر پر، دکھ ساگر میں پورم پور
سونے کو کانٹوں کا بستر، چلنے کو سانسوں کی ڈور
زخموں کے بازار سجے ہیں، کوچے کوچے جیون چور
بوسیدہ کاغذ کے فرماں، دھاتوں کے ٹکڑوں کا زور
بے حس جذبے، جامد لمحے، مرنا دوبھر، جینا بور
کس جنگل میں ناچے مور!

نئے خدا کا قہر

سونگھ رہا ہوں کھیتوں کی شاداب ہوا میں زہر

بوڑھا برگد چیخ رہا ہے بچے پھول نہ توڑ
مسجد کے مینار پہ لٹکی دو بیلوں کی جوڑ
مندر کی دیوار پہ چسپاں نوٹنکی کا ناچ
الھڑ دوشیزہ بھڑکاتی عطر حنا کی آنچ
شر میلے بھولا نے آخر ڈاٹ لیا پتلون
چوپالوں پر بک جاتا ہے طاقت کا معجون
چپکے چپکے گھس آیا ہے میرے گاؤں میں شہر
سونگھ رہا ہوں کھیتوں کی شاداب ہوا میں زہر

چلتا جائے چاک

چلتا جائے چاک

ہر چکر پورا ہونے پر
تھوڑی مٹی چڑھ جاتی ہے
اور تھپیڑے کھاتے کھاتے
اونچائی کچھ بڑھ جاتی ہے
پھر اس چک پھیری کے ہاتھوں
پوری مورت گڑھ جاتی ہے
پاگل کو ہونے لگتا ہے ہونے کا ادراک
(تین پات کا ڈھاک)

چلتا جائے چاک

کچی مٹی کی یہ مورت
'میں' کی بھٹی میں پکتی ہے
بھگتی کے آسن پر چڑھ کر
اپنی پوجا کر سکتی ہے۔
کہتی ہے کم زوری کیسی
مجھ میں شکتی ہی شکتی ہے
لیکن رات اور دن کی چکی کر دیتی ہے خاک
(یعنی قصہ پاک)
چلتا جائے .....

ایک طنزیہ نظم

کہتے ہیں کل حروفِ تہجی میں چل گئی
بے نے الف کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی

دو چشمی ہے نے نون کا نقطہ چرا لیا
غصے میں اس نے میم کی گردن مروڑ دی

رے نے چھری سے پھاڑ دیا پیٹ جیم کا
پے اور تے کی جوڑ کھڑی دیکھتی رہی

دنگل میں غین، گاف کی چھاتی پہ چڑھ گیا
لیکن یہ قول دال یہ کُشتی نہیں ہوئی

جل کر ستار توڑ دیا زے نے جس جگہ
ڈال اور فے کی ڈفلی بڑے ٹھاٹ سے بجی

پیروں میں ان کے پایا گیا طوئے کا نشاں
ڑے نے جناب عین کی عزت خراب کی

پیچھے سے آ کے ٹوٹ پڑا سین شین پر
تقسیم نقطہ ہائے وراثت کی بات تھی

کھودا گیا تھا یے کا گڑھا قاف کے لیے
لیکن صواد وضواد کی سازش نہیں چلی

جلسے سے واؤ بھاگ گیا ڈھول مار کر
کہتا ہے فے کہ لام سے اُف تک نہیں سُنی

مرکز ملا جو کاف کا ہمزہ کی جیب میں
چے، ظوے اور تے نے بڑی لعن طعن کی

محفل میں ٹے نے ذال کو ٹھینگا دکھا دیا
ہڑبونگ جو مچی تھی، نہیں ہے وہ گفتنی

حیران کیوں ہیں لوگ مظفر کی نظم پہ
وہ پیش کر رہا ہے علامت کی شاعری

ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم

بھٹک رہے ہیں ہزار، دو ایک ہیں جو راہوں کو جانتے ہیں
بلا سے کانٹے ہٹا نہ پائیں مگر کئی خاک چھانتے ہیں
وہ چند فیصد ہوں، پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو مذہب کو مانتے ہیں
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم۔

بڑھی ہوئی احمقوں کی بستی میں کوئی دانا بھی مل رہا ہے
فریب کے ڈھیر تھے جہاں پر، خلوص بھی ایک تل رہا ہے
کہیں کہیں ریگ زار میں، نیم وا سہی، پھول کھل رہا ہے
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم۔

نگر نگر بس رہے ہیں کج بیں تو ایک دو صاحب نظر ہیں
جنھیں حقیقت میں قوم کا غم ہو، لاکھ میں دو سہی، مگر ہیں
کردار میں ایک ہی سہی، کچھ مگر ابھی راہ راست پر ہیں
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم۔

ہزار پتھر پڑے جو سر پر تو چند ہم دردیاں بھی پائیں
رقیب سے دوستی ہوئی ہے محبّتیں جب نہ راس آئیں
طویل تر تھیں مہیب راتیں تو صبح بھی اپنے ساتھ لائیں
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم۔
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم کہ ظلم سہتے ہیں منھ بنا کر
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم کہ جھوٹ کہتے ہیں سر جھکا کر
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم گناہ کرتے ہیں چھپ چھپا کر
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم
ابھی مہذب نہیں ہوئے ہم

اُسی کو باندھ کے پھینک آئے لوگ دریا میں
وہی تو شہر میں کشتی بنانے والا تھا

رُباعیات

گھیرے میں لیے ہوں تجھے ہالہ بن کر
لپٹا ہوں ترے پاؤں سے چھالا بن کر
اے روشنیِ طبع جھجکتی کیوں ہے
ظلمت ہوں، مجھے کاٹ اُجالا بن کر

تریاق نہ لا مارگزیدہ ہی نہیں
مرہم نہ لگا، زخم رسیدہ ہی نہیں
عرفان کی اس دھوپ میں جلتا ہے یہ دوُر
جس میں کوئی دیوار عقیدہ ہی نہیں

بے خوابی کو للکار کے رہ جاتی ہے
لوری کی صدا ہار کے رہ جاتی ہے
بچے کے تحفظ کا وہ عالم ہے کہ نیند
دیوار سے سر مار کے رہ جاتی ہے

خطرے کے نشانوں میں اناڑی نالہ
موسم کا خطرناک کھلاڑی نالہ
سوئے ہوئے بچّے کی طرح چونک پڑا
بادل کے گرجنے سے پہاڑی نالہ

مرنا ہے تو بے موت نہ مرنا بابا
دم سادھ کے اس پُل سے گزرنا بابا
سنتے ہیں کہ ہے موت سفر کا وقفہ
اس پار ذرا بیچ کے اترنا بابا

موتی نہ تھے دریا میں تو ہم کیا کرتے
آنسو ہی نہیں آنکھ میں غم کیا کرتے
ہاتھ آئے وہی کھوکھلے لفظوں کے صدف
گہرائی کی رُوداد رقم کیا کرتے

تقدیر پہ الزام نہیں دھر سکتے
خاکے میں سیہ رنگ نہیں بھر سکتے
ہر لوح پہ تحریر کہ جینا ہے حرام
آواز لگا دو کہ نہیں مر سکتے

ہاتھوں میں لیے تیغ و سناں بیٹھا ہے
ہمزاد نہیں دشمنِ جاں بیٹھا ہے
جس جا بھی متاعِ فکر لے کر بیٹھوں
لگتا ہے کوئی اور وہاں بیٹھا ہے

محدود فضاؤں میں کدھر جاؤں میں
مجلس میں کہیں گھُٹ کے نہ مر جاؤں میں
لازم ہے پر و بال سنبھالے رکھنا
ایسا نہ ہو آپے سے گزر جاؤں میں

کیا عرض کروں پست کہ قد آور ہوں
باہر سے تو اندر ہی کا پس منظر ہوں
ہاں قد سے خیالات اگر جوڑے جائیں
مَیں اپنی رسائی سے بھی بالا تر ہوں

منظور نہیں تلخ نوائی مجھ کو
تو نے ہی عطا کی تھی کج ادائی مجھ کو
سر خم ہو بہ ہر حال یہ سجدہ ہے کہ بوجھ
راس آ نہ سکی تیری خدائی مجھ کو

احساس کی مت پوچھ عجب شے ہے یہ
ہر سانس پہ بجتی ہوئی اک نے ہے یہ
خنجر سے خیالات نہیں کٹ سکتے
احساس ہی مارے گا مجھے طے ہے یہ

اپنے کو کوئی ایسے بھی اپناتا ہے
اب صید خودی بچ کے کہاں جاتا ہے
پہچانا ہے خود کو توڑ سے بھی خود کو
آئینے میں اِک سانپ سا لہراتا ہے

مر مر کے فنا کا غار پاٹو یارو
سانسوں کی یہ زنجیر بھی کاٹو یارو
اس سے پہلے کہ روح گھُٹ کر مر جائے
چاٹو، دیوارِ جسم چاٹو یارو

شبنم ہے کہ تاروں کے وضو کی بوندیں
یہ پھول گرے کہ رنگ و بو کی بوندیں
احساس کا یہ حال کہ ہر منظر پر
آنکھوں سے ٹپکتی ہیں لہو کی بوندیں

بادل تو جمائے تھے پہاڑوں پہ نگاہ
دریاؤں کو جانا تھا سمندر کی راہ
یوں حدتِ صحرا کو پسینے آئے
گرتے ہوئے شبنم نے کہا بسم اللہ

موسم کے تقاضے پہ ذرا سوچو نا
انجام ہے مطلع کا مکدّر ہونا
کھانے کی کوئی چیز اُگا لو پہلے
پھر شوق سے کھیتوں میں ستارے بونا

کمرے میں سُبک رنگ بکھر جائیں گے
بے ساز کے نغمات سنائی دیں گے
بستر پہ مرے آ کے تماشہ دیکھو
چادر پہ کڑھے پھول مہک اٹھیں گے

میں دھار سے کٹ جاؤں گا دھیرے دھیرے
ذرات میں بٹ جاؤں گا دھیرے دھیرے
ڈھلوان پہ بہنے میں ہے دریا کی موت
مخرج کو پلٹ جاؤں گا دھیرے دھیرے

صحرا مجھے ہر گام پہ زک دیتا ہے
منزل مرے ہاتھوں سے جھٹک دیتا ہے
لیکن مرے پاؤں تھمنے لگتے ہیں جہاں
شفقت سے مری پیٹھ تھپک دیتا ہے

جملوں میں مقید ہیں پریشان الفاظ
منھ بند، سسکتے ہوئے حیران الفاظ
افسانے گڑھے، شعر کہے، نظم لکھی
الفاظ نرے کھوکھلے، بے جان الفاظ

ہر گام پہ سو بار جھجکتی حیرت
آئینہ در آئینہ بھٹکتی حیرت
رہبر نہ اگر جھوٹ سا ملتا اس کو
سچ کو کبھی پہچان نہ سکتی حیرت

ہر چند کہ امرت ہو ہزاروں کے لیے
پیادے ہی تو کٹتے ہیں سواروں کے لیے
مردار عقائد کے سنہرے پتّو!
پت جھڑ بھی ضروری ہے بہاروں کے لیے

احساس ہو مردار کہ تاریک ضمیر
تا دیر لرزتی ہے کماں چھوڑ کے تیر
ظالم کا ہر اک فعل سزا ہے اس کی
زنجیر ہے زنجیر برائے زنجیر

ٹوٹے ہوئے پر چھوڑ گیا ہے راہی
جلتا ہوا گھر چھوڑ گیا ہے راہی
منزل پہ پہنچنا تھا اسے عجلت میں
رستے میں یہ سر چھوڑ گیا ہے راہی

یہ موسمِ گُل اور یہ لُو کے جھکّڑ
پُر نور فضاؤں میں یہ کالے اندھڑ
اِس چاند کی چودہ کو لگا ہے کرفیو
چلنے لگی بندوق کہیں تڑ تڑ تڑ

بھوکا تھا مگر چھوڑ دیا روٹی کو
کس ڈھنگ سے سمجھاؤں میں اپنے جی کو
غلّے کے تقاضے پہ اُلجھ کر آخر
ہمسائے نے پھر پیٹ دیا بیوی کو

چینی کہیں غائب ہے کہیں گھی غائب
غلّہ کہیں عنقا کہیں ہلدی غائب
پیسہ ہو اگر پاس تو اِک نسخہ ہے
اخبار نہ پڑھیے تو غریبی غائب

لفظوں میں نہ وسعت ہے نہ گرمی نہ عمق
ترسیل کو ہر گام پہ سو سو خندق
کہنے کو بہت، اور کہا جائے نہ کچھ
جذبہ ہے کہ احساس میں پھولی ہے شفق

ملنا ہو جسے اپنے پرستاروں سے
دروازے سے رُکتا ہے نہ دیواروں سے
وہ موت ہو یا صبح مگر ہے کوئی
آتی ہے قدم کی چاپ اندھیاروں سے

ماحول سے جس وقت نہیں کھاتی میل
اس وقت دکھاتی ہے انا کیا کیا کھیل
سنگینی حالات سے جھکتی ہے مگر
جس طرح کسی پُل سے گذر جائے ریل

گھنگھور گھٹا ٹوپ اندھیرا اور موت
ہر سمت وہی آہنی گھیرا اور موت
گھبرا کے جو اندر سے چٹخنی کھولی
در آئے بہ یک وقت سویرا اور موت

دیکھا کہ ہر اک شخص لہو میں تر تھا
اور بحر شجاعت مرا کف آور تھا
پھر آنکھ کھلی، چونک پڑا، یا حیرت
خود اپنی ہی گردن پہ مرا خنجر تھا

ہر چند کہ منظور نہیں ہے آرام
آمد میں رکاوٹ ہے نہ جذبہ ہے خام
لیکن وہ بہت دنوں کے بعد یاد آئے ہیں
فی الحال تو اے فکرِ شعر، تجھ کو سلام

ثانی تھے نہ دارا و سکندر میرے
ہوتی یہ زمیں اور سمندر میرے
افسوس کہ یلغار کو جب اٹھتا ہوں
ہنستا ہے کوئی جسم کے اندر میرے

آفت ہے یہ الحاد مظفرؔ صاحب
خود ساختہ بے داد مظفرؔ صاحب
مشکل میں خدا کو یاد کرتے ہیں لوگ
ہم کس کو کریں یاد مظفرؔ صاحب

گر خود کو سنبھالوں نہ میں آنسو کی طرح
یہ فن بھی ہے تاثیر میں جادو کی طرح
دن رات گھمائے مجھے صحرا صحرا
خوشبوئے سخن، نافۂ آہو کی طرح

بھڑکی ہوئی اِک مشعلِ غم رکھتا ہوں
شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں
دُکھتی ہوئی رگ اپنی چھپالے دنیا
مجبور ہوں کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

شعلہ ہے، اُسے چوم رہا ہوں پھر بھی
خالی ہے سبو، جھوم رہا ہوں پھر بھی
وہ مجھ سے گریزاں ہے ہوا کی مانند
پنکھے کی طرح گھوم رہا ہوں پھر بھی

پندارِ خودی توڑے ہوئے بیٹھا ہوں
تخلیق سے منھ موڑے ہوئے بیٹھا ہوں
احباب میں شہرہ مری پرواز کا ہے
حالاں کہ میں پر جوڑے ہوئے بیٹھا ہوں

کہنے کے لیے صبر تو کر جاؤں گا
لیکن یہ گھٹن بڑھی تو مر جاؤں گا
فطرت سے میں بادل ہوں برس جانے دو
پھر جھیل کے اس پار اتر جاؤں گا

اس دھوپ کو دیوار سے ڈھل جانے دے
مغرور کے ارمان نکل جانے دے
پھر ہاتھ لگاتے ہی نہ بل ہونگے نہ وہ
رسّی کو ذرا ٹھیک سے جل جانے دے

ہم درد ملے تو درد دونا ہوگا
بستر بھی جہنّم کا نمونا ہوگا
بے کاری کا یہ زخم یہ کھجلاتے ہاتھ
بجلی کے کھلے تار کو چھونا ہوگا

نیچا رکھنا مزار اونچا رکھنا
جتنا چاہو حصار اونچا رکھنا
تسلیم ہر اک جرم، مگر میرے لیے
اوروں سے صلیب و دار اونچا رکھنا

یہ آن یہ تیور یہ جبینوں کے بل
حالاں کہ تم آ گئے ہو سفینوں کے بل
اک ہم ہیں کہ امواجِ بلاخیز میں ہیں
اور پھر بھی بڑھے آتے ہیں سینوں کے بل

یکساں ہے مرے واسطے جینا مرنا
کیوں سر پہ پھر احسان کسی کا دھرنا
اے موت مرا ہاتھ نہ تھام، آگے بڑھ
میں ڈوب رہا ہوں تو تجھے کیا کرنا

سچ ہے کہ ابھی عمر پڑی ہے مجھ کو
دُھن زود نویسی کی بُری ہے مجھ کو
ڈرتا ہوں قلم کو بھی مرے چاٹ نہ جائے
احساس کی دیمک جو لگی ہے مجھ کو

وحشت کی ذرا چوٹ پڑی، ٹوٹ گئی
زنجیر کی ایک ایک کڑی، ٹوٹ گئی
انگڑائی ابھی لی تھی رہائی پا کر
اتنے میں وہ موتی کی لڑی ٹوٹ گئی

جس روز بھی دھوکے سے چڑھا لیتا ہوں
احساس کی لَو اور بڑھا لیتا ہوں
اس طرح بہکتا ہوں کہ اپنے اوپر
شیطان سے لاحول پڑھا لیتا ہوں

مرمر کی طرح سپید چاندی سے بدن
کاغذ کے معاشرے میں شیشے کے بدن
دیکھو یہ کھلی کوٹھریاں کاجل کی
شفاف، چمکتے ہوئے لو دیتے بدن

ہو خام تو لفظوں میں اٹک جاتا ہے
کاغذ کے سفر سے قبل تھک جاتا ہے
جذبات ابلتے ہیں تو ہوتا ہے شعر
پکّا ہوا پھل خود ہی ٹپک جاتا ہے

صابن کی طرح کاٹ رہا ہے مجھ کو
دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے مجھ کو
رستے میں بنا رکھی ہے میں نے جو خلیج
ہم زاد مرا پاٹ رہا ہے مجھ کو

اب تک وہی افسانۂ محمود و ایاز
سچ ہے کہ تضادات کی رسّی ہے دراز
دامن میں وہ بت خون کے، رنگوں کے صنم
ظاہر میں مساوات کی اونچی آواز

ہر چند کہ فنکار کہا جاتا ہوں
میں وقت کے دریا میں بہا جاتا ہوں
کیا کیا نہ لکھا جائے گا میرے پیچھے
افسوس کہ محروم رہا جاتا ہوں

سمٹے ہوئے کوزے میں سمندر جیسے
اِک تار میں گوندھے ہوئے گوہر جیسے
آموختہ پڑھتے ہوئے چنچل بچے
پر جوڑ کے آ بیٹھے ہوں کبوتر جیسے

03448183736